سخن در سخن :- از جناب نواب مظفر الدین خان صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۱۴ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت للعہ پتہ :- ولا اکیڈمی "عزیز باغ" سلطان پورہ حیدر آباد ۲۴۔

یہ حیدر آباد کے نواب مظفر الدین خان صاحب کی رباعیات وقطعات کا مجموعہ ہے، وہ ۶۰ برس سے مشق سخن فرماتے ہیں لیکن ابھی انکا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے، رباعی کے اوزان و بحور متعین ہونے کی وجہ سے وہ مشکل صنف سخن ہے اسلئے ماہر فن اور قادر الکلام شعرا ہی اس میں طبع آزمائی کرتے ہیں حیدر آباد کے بعض شعرا نے اسکی جانب خاص التفات کیا ہے ان میں امجد حیدر آبادی اردو کے ممتاز ترین رباعی گو تھے، انکے معنوی فیض واثر نے صاحب کتاب کو بھی اسکی جانب مائل کر دیا، اور انھوں نے عشقیہ اخلاقی اور حزنیہ ہر طرح کی رباعیات کہی ہیں، رباعیات کی طرح قطعات کے موضوع میں بھی تنوع ہے اور وہ عاشقانہ فلسفیانہ اور اخلاقی ہر قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں رباعیات وقطعات دونوں میں روانی و بے ساختگی اور طرز ادا کی جدت وخوبی بھی ہے مزید مشق ومہارت سے انکے رنگ میں زیادہ پختگی اور نکھار پیدا ہوگا۔

آریہ سماج کی ترقیاں حصہ اول و دوم۔ مترجم جناب فدا حسین صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت معمولی صفحات ۱۰۴ و ۲۴۶ قیمت :- عہ و سے پتہ کٹرہ شہاب خان، اٹاوہ۔ یو۔ پی

ہندوؤں کی مشہور تنظیم آریہ سماج گذشتہ پون صدی سے زیادہ عرصہ سے اپنے مشن میں سرگرم ہے، اس کتاب میں انکے مشہور ہندی آرگن آریہ مستر اور دوسری کتابوں اور اخبارات کی مدد سے انکی پچھتر سالہ کارگزاریوں اور مختلف النوع کاموں کا جائزہ لیکر مختلف شعبوں اور دائروں میں انکی ترقیاں دکھائی گئی ہیں، پہلے حصہ میں آریہ پرتھی ندی سبھا اتر پردیش کا مختصر تعارف، تاریخ ۶۳ء میں آریہ سماج کی ڈائمنڈ جوبلی کے پیغامات اور تجویزیں وغیرہ نقل کی گئی ہیں پھر انکے اخبار، صوبائی کانفرنس، بعض تقریبات، مذہبی، سماجی، علمی اور تعلیمی خدمات اتر پردیش کے آریہ سماجی اسکولوں اور کالجوں اور بعض مشہور مذہبی وسیاسی رہنماؤں اور ضلع وار ترقیوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں تبلیغی اداروں، ملک و بیرون ملک میں تبلیغی جدوجہد ہندی کے تحفظ اور ہندوؤں میں مذہبی بیداری پیدا کرنے اور شدھی وغیرہ کے سلسلہ میں گوناگوں خدمات کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مختلف سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے حمایتی بیانات اور آریہ سماجیوں کی مسلمانوں اور عیسائیوں سے رد وکد کا ذکر ہے، لائق مترجم نے آریہ سماج کی سرگرمیوں اور ترقیوں سے اردو داں طبقہ خصوصاً مسلمانوں کو واقف کرانے کیلئے یہ کتاب لکھی ہے تاکہ وہ ان پر غور وفکر کرکے اپنے متعلق انکے طرز عمل سے آگاہ ہوں۔

"ض"

401

جلد ۱۱۴ عدد ۶

ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

معارف

معارف کے گذشتہ بعض سالوں کے مکمل فائل، اور متفرق پرچوں کے بیے جن کی بڑی تعداد محفوظ ہے، دفتر سے خط وکتابت کیجئے، ان کی قیمتوں میں کافی رعایت کر دی گئی ہے۔ "مینجر"

شذرات

خدا خدا کرکے ہندوستان و پاکستان کے ڈاک، تار اور ٹیلیفون کی سہولتیں بحال کردی گئی ہیں، اب دونوں ہمسایہ ملکوں کے اعزہ واقربا کی خیریت معلوم کرنے میں پہلے کی طرح پھر آسانیاں ہوگئی ہیں، ورنہ ایک دوسرے کی بےخبری سے بڑی بےچینی اور پریشانی تھی، ممکن ہے کہ آگے چل کر ان دونوں ملکوں کی آیندہ نسلوں میں رشتے ناطے کا سلسلہ ختم ہوجائے، مگر موجودہ نسل اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کو ابھی بھول نہیں سکتی، ملک کی تقسیم سے خاندانوں کی بھی تقسیم ہوگئی ہے، باپ بیٹے، بھائی بہن حتیٰ کہ شوہر بیوی سے اب تک جدا ہیں، لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ اب تک ایک دوسرے کے ساتھ یکجا نہیں ہوسکے ہیں، حکومتوں کے سیاسی مصالح اپنی جگہ پر ہیں، مگر ان مصالح کے ساتھ انسانیت نوازی بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی ہے، اس کی اعلیٰ قدریں اگر سیاست پر غالب رہیں، تو بہت سی سیاسی پیچیدگیاں خود بخود دور ہوتی جائیں گی، ادھر ہندوستان نے پاکستان سے اچھے تعلقات پیدا کرنے میں فراخدلی کا ثبوت دیا ہے، پاکستان کو بھی اس کے جواب میں اپنی رواداری اور سیرچشمی کا اظہار کرنا چاہئے، سیاست میں نشیب و فراز ہوا ہی کرتا ہے، مگر وسعت قلبی، انسانی ہمدردی، مہر و محبت اور لطف و کرم کبھی رائگان نہیں جاتے، اگر ان انسانی قدروں سے عارضی طور پر کچھ سیاسی نقصان پہونچ بھی جاتا ہے تو اس نقصان کے پیچھے دیرپا فوائد بھی ہوتے ہیں، دنیا کی تاریخوں میں ایسی مثالیں بہت ملیں گی۔

دونوں ملکوں میں ڈاک کی سہولتیں تو ضرور پیدا ہوگئی ہیں، لیکن پہلے کی طرح ڈاک کی شرح قائم نہیں رہی،

بلکہ اس میں غیر معمولی اضافہ کردیا گیا ہے، اسکی وجہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی، پہلے دونوں ملکوں کی ڈاک کے محصول یکساں تھے، تو خیال ہوتا تھا کہ ان دونوں کی جغرافیائی تقسیم تو ضرور ہوگئی ہے، لیکن دراصل دونوں ایک ہی ہیں، مگر اب نئے محصول سے اگر یہ خیال پیدا ہو تو یہ شاید غلط نہ ہوگا کہ برصغیر کے یہ دونوں ملک اب ایک نہیں رہے، بلکہ ایشیا اور یورپ کے اور ملکوں کی طرح اجنبی ہوگئے، گو کارڈ اور لفافے کی شرح میں پھر بھی نسبتاً کچھ کمی رکھی گئی ہے، دونوں ملکوں نے غیر شعوری طور پر اپنے اس احساس کو باقی رکھا ہے کہ ابھی وہ بالکل ہی بیگانہ نہیں ہوئے ہیں، ڈاک کی نئی شرح سے اب تک یہ واضح نہیں ہوسکا ہے کہ دونوں ملکوں میں اخبارات اور خصوصاً علمی رسائل کے بھیجنے میں خرچ کیا ہوگا، انجمن ترقی اردو کراچی نے ڈاک کھلتے ہی بڑی عجلت کے ساتھ اپنا سہ ماہی رسالہ اردو بھیج کر دارالمصنفین سے اپنے علمی تعلقات قائم کئے، مگر وہاں سے یہ دو رسالے ساڑھے چار روپیے میں آئے، ظاہر ہے کہ اتنا گران تبادلہ کسی لحاظ سے مناسب نہ ہوگا، مگر ابھی پشاور سے رسالہ الحق دو پیسے کے ٹکٹ ہی میں یہاں پہونچ گیا ہے، پاکستان سے رسالہ معارف کی طلب جاری ہوگئی ہے، اور جس اشتیاق سے وہاں کے علمی حلقوں میں اس کا انتظار کیا جارہا ہے، اس سے اسکی اہمیت اور مقبولیت کا اظہار ہوتا ہے، مگر اب تک یہ رسالہ وہاں بھیجنا ممکن نہ ہوسکا ہے، کیونکہ مقامی ڈاک گھروں میں اسکی سرکاری اطلاع باضابطہ نہیں پہونچی ہے کہ اسکے بھیجنے میں کتنے کا ٹکٹ لگانا ہوگا۔

پاکستان کے علمی حلقوں نے جہاں اس ادارہ سے اپنے خوشگوار تعلقات کے قائم ہونے پر اظہار مسرت کیا ہے وہاں ایک ہمدرد نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ سعید اینڈ سنز کراچی، سیرۃ النبی کی جلدیں چھاپ رہے ہیں، تین جلدیں تو چھاپ چکے ہیں، بقیہ اور چھاپنے کا ارادہ کررہے ہیں، اس ادارہ کی طرف سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ پاکستان کے ناشرین اپنے ذاتی منافع کی خاطر اسکو نقصان نہ پہونچائیں، وہ اسکی مدد نہیں کرسکتے تو اسکو نقصان بھی نہ پہونچائیں، ۱۹۶۹ء میں پاکستان میں قانونی طور پر اس کا اہتمام کیا گیا تھا کہ وہاں کے ناشرین یہاں کی مطبوعات نہ چھاپیں، ورنہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائیگی، ضرورت ہوئی تو قانون کا سہارا لیا

لیا جائے گا، مگر ابھی تو پاکستان میں اس ادارہ کے ہمدردوں سے بھی اپیل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی دباؤ سے ایسے ناشرین کو اس ادارہ کو نقصان پہونچانے سے باز رکھیں، ورنہ علم و فن کا یہ دیرینہ ادارہ ختم ہو جائیگا، اور اس کا خون پاکستان کے خودغرض ناشرین کے سر رہے گا، یوں بھی یہ ادارہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ساتھ روز بروز مالی بحران میں مبتلا ہوتا جارہا ہے۔

ہر چیز کی گرانی کے ساتھ کاغذ کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اب تک تین گنی قیمت کا اضافہ ہو چکا ہے، چھپائی کے اور ضروری سامان کی قیمت بھی اسی حساب سے بڑھ رہی ہے۔ ایک کتاب کی لکھائی چھپائی میں جو اخراجات ہوتے ہیں، اسی لحاظ سے قیمت بھی رکھی جائے تو خریداروں کی قوت خرید ساتھ نہ دے سکے گی، اس لیے یہ ادارہ بڑی کشمکش میں مبتلا ہوتا جارہا ہے جس سے اس کی مالی پریشانیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں، پھر بھی یہاں کی مطبوعات کی قیمت اور کتابوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے، اگر ان کتابوں کی فروخت ہوتی رہے تو یہ ادارہ تائید ایزدی کے ساتھ اپنی علمی خدمت میں لگا رہے گا، اس کے خدمت گذاروں پر بہت سے فرائض برابر عائد کئے جاتے رہے ہیں، مگر وہ اپنے حقوق کے بھی طلب گار ہیں، جو صرف اتنے ہیں کہ یہاں کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ خرید کر کے اسکو مالی بحران سے محفوظ رکھا جائے۔

معارف کے پرانے رسالوں کی بڑی تعداد محفوظ ہے، جو رعایتی قیمت پر اب فروخت کئے جارہے ہیں، زیادہ تر ہر سال کے بھکر پرچے ہیں، مگر ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کے مکمل فائل موجود ہیں، معارف کے شائقین ان کو خرید سکتے ہیں۔

مقالات

دیارِ پورب کا دوسرا علمی دور

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

دیار پورب کا پہلا علمی دور سلطان قطب الدین ایبک کی ابتدائے سلطنت ۶۰۲ھ سے شروع ہو کر خلجی دور سے ہوتا ہوا تغلق دور ۷۷۲ھ میں جون پور کی تعمیر و تمصیر پر ختم ہوا، اس پونے دو سو سالہ دور میں پورب میں علماء و فضلا اور مشایخ کی اچھی خاصی تعداد مختلف قصبات و قریات میں پائی جاتی تھی، مگر مانک پور کڑا کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا تا آنکہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں شہر جونپور آباد کر کے ایک عظیم علمی و دینی مرکز قائم کیا، اور حضرت قطب الاسلام حاجی صدر الدین چراغ ہندی ظفرآبادی کی ذات والا صفات سے سواد جونپور میں اسلام کو فروغ ہوا، اور عہد فیروز شاہ تغلق سے لیکر خاتم السلاطین محمد شاہ کے دور تک تقریباً چار سو سال یہ شہر اپنے حدود سمیت علم و فضل اور علماء و فضلاء کا گہوارہ بنا رہا، اس چار سو سالہ دور میں تغلقی شرقی، لودی اور تیموری سلطنتوں کی آمد و رفت رہی، مگر دیار پورب اور حدود جونپور کی علمی و دینی محفل کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا اور تخت و تاج کے انقلابات کی زد سے مسجد و مدرسہ اور دلق و سجادہ محفوظ رہے، اس پورے دور کی علمی سرگرمی کا اجمالی

نقشہ مولانا خیر الدین محمد الہ آبادی جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں اس طرح کھینچا ہے :-

" یہ شہر اپنی بنیاد کے وقت سے معدن علم اور مخزن فضل و کمال رہا ہے، ملا محمد اصفہانی نے سیر الملوک میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبہ جات دانشمندوں اور باکمال لوگوں کے مولد و منشا ہیں خاص طور سے صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد ان دونوں صوبوں کے ہر شہر و قریہ میں مدرسے خانقاہیں اور مسجدیں اساتذۂ علوم و فنون سے آراستہ رہتی ہیں۔ اور ہر مدرسہ اور خانقاہ میں صدہا طالبانِ علوم اور کامیابان فیوض نعرۂ ھل من مزید بلند کرتے ہیں، صوبہ الہ آباد کے متعلقات میں ایک شہر ہے جسے سلطان فیروز دہلوی نے ۷۷۲ھ میں آباد کر کے جونپور کے نام سے موسوم کیا، یہ شہر سلاطین شرقیہ کے عہد میں دار السلطنت قرار پایا، اور شہر اور اس کے اطراف و جوانب میں صدہا مساجد و مدارس تعمیر ہوئے. مختلف اقلیموں کے علماء و فقراء اس شہر میں پہنچے اور ہر ایک کے لئے وہاں کے سلاطین و حکام کی طرف سے وظائف اور جاگیریں مقرر ہوئیں تاکہ مدرسین طالب علموں کی تعلیم و تدریس میں اور مشائخ تلقین و تربیت میں جمعیتِ خاطر کے ساتھ کوشش کریں اور جو طلبہ دور دراز مقامات سے جوق در جوق آتے تھے، ان کی خاطر داری اور عزت و احترام میں مدرسوں اور خانقاہوں کے ذمہ داروں میں سے ہر ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتا تھا، ایران کے بادشاہ طہماسپ نے سلطان ہمایوں سے پہلی ہی ملاقات میں فضلائے جون پور کے متعلق دریافت کیا، اور اس دیار میں علماء کی کثرت و انبوہ معلوم کر کے شہر شیراز کی ویرانی پر حسرت و افسوس کیا، اور اسی دن حکم صادر کیا کہ شیراز میں مدارس کی تاسیس اور وہاں کے علماء کی تعظیم و توقیر کی جائے اور اصفہان اور اسکے

اطراف و جوانب میں مدرسے اور خانقاہیں بنا کر علماء کو تعلیم و تعلم پر مامور کیا،

تاریخ شاہجہانی میں لکھا ہے کہ صاحبقراں شاہجہاں نے شہر جونپور کو شیراز ہند کا لقب دیکر اسے دار العلم سے موسوم فرمایا ہے، الغرض سلطان فیروز شاہ کے عہد سے لیکر خاتمۃ السلاطین محمد شاہ کی سلطنت تک یہ شہر مجمع فضلاء و مرجع طلبہ رہا ہے اور یہاں کے علماء و مشائخ کی تعظیم و توقیر کے لئے سلاطین کے احکام و فرامین حکام جونپور کے پاس پہونچتے رہے، ان بزرگوں کی معاشی مدد اور حفظ مراتب کے لئے صدر اور بخشی مامور کئے جاتے تھے، جو وقائع نگار سلاطین کے دربار سے جون پور کے حالات لکھنے پر مامور کئے جاتے تھے وہ ہر مدرسہ اور خانقاہ میں خود جا کر ان کے کوائف معلوم کر کے سلاطین تک پہنچاتے، اور ہر زمانہ کے بادشاہ مدرسین اور مشائخ کا آمد و خرچ معلوم کر کے ان کی ضرورت کے مطابق وظائف اور قطائع میں اضافہ کیا کرتے تھے، جو شاہزادے اور امرائے سلطنت اس دیار سے گذرتے تھے، سلاطین کی رضا جوئی کے خیال سے معتقدانہ انداز میں ہر مدرسہ اور خانقاہ میں حاضر ہو کر زیادہ سے زیادہ نذر گذرانتے تھے" الخ[۵]

دیار پورب کے اس چار سو سالہ علمی اور دینی دور کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر کے بنائے جون پور ۷۷۲ھ سے لیکر لودھی سلطنت کے خاتمہ ۹۳۲ھ تک کی ایک سو ساٹھ سالہ مدت کو یہاں کا دوسرا علمی دور قرار دیتے ہیں، جس میں تغلقی شرقی اور لودی سلطنتوں کا عروج و زوال ہوا، آیندہ سطروں میں ہم ہر دور کے کی علمی و دینی سرگرمی کا جائزہ لیں گے، خاص طور سے سلاطین و امراء اور مشائخ و علماء کے خوش گوار تعلقات کو بیان کریں گے،

تغلق دور میں علم و علماء

تغلق خاندان کا تیسرا حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق محرم ۷۵۲ھ

میں تخت سلطنت پر بیٹھا، وہ اس کے لئے آمادہ نہیں تھا، مگر شیخ نصیر الدین محمود ابن یحییٰ اودھی چراغ دہلی اور دیگر علما و مشایخ نے زور دیکر اسے راضی کیا، رمضان ۷۹۰ھ میں فوت ہوا، سلطان فیروز شاہ تعمیرات اور اہل علم و فضل کا شیدائی تھا، اسکے دور سلطنت میں علما و مشایخ کو سالانہ ۳۶ لاکھ تنکہ وظائف دیئے جاتے تھے، برنی نے اسی کے نام پر تاریخ فیروز شاہی لکھی، اس نے دہلی میں مدرسہ فیروزیہ اور مسجد تعمیر کی، فیروز آباد آباد کیا اور اپنی سلطنت کے بیسویں سال ۷۷۲ھ میں جونپور کو آباد کرکے دیار پورب کو دار العلم و العلماء بنایا، حقیقت یہ ہے کہ اسی بادشاہ کی علم پروری اور علما نوازی نے سرزمین پورب کو دار العلم، دار الامان، دہلی ثانی اور شیراز ہند بنایا،

سلطان فیروز شاہ نے جون پور کو آباد کرکے بیک وقت اسکو مشرقی علاقہ کا دار الحکومت اور دار العلم بنایا اور شہزادہ فتح خاں کو وہاں کا حاکم اور مولانا علاء الدین دہلوی کو مدرس و معلم بنا کر بھیجا، ایک نے اسکا ملکی نظام سنبھالا اور دوسرے نے مملکت علم کے نظم و نسق کو درست کیا، تذکرۃ العلماء میں تاریخ شاہی کے حوالہ سے مرقوم ہے کہ مولانا علاء الدین دہلوی تغلق دور کے مشاہیر علما اور اکابر فضلاء میں تھے، سلطان فیروز شاہ نے جون پور آباد کرکے ان سے منت و سماجت سے استدعا کی کہ وہاں تشریف لیجا کر طلبہ کو درس دیں، مولانا انکار کے بعد جب جانے کے لئے تیار ہوئے تو سلطان نے ان کی خدمت میں خود حاضر ہو کر انعام و اکرام سے خوب نوازا، اور شاہانہ انداز پر لوازم سفر مہیا کئے، اپنا خاص گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا، اور خود رکاب پکڑ کر مولانا کو اس پر بٹھایا اور وہ چار سو شاگردوں کے ساتھ دہلی سے جون پور کے لئے روانہ ہوئے، سلطان نے ان تمام طالب علموں کو بھی عطایا دیئے، اور ایک شاہی امیر کو اس قافلہ

خدمت کے لئے ساتھ کیا، اور راستہ کے تمام امراء و حکام نے اپنی اپنی سرحد میں اس علمی و دینی کارواں کا شاندار استقبال کیا، شاہزادہ فتح خاں نے جو اپنے والد سلطان فیروز شاہ کی طرف سے حاکم جونپور تھا، یہاں موجود تھا، مولانا کی آمد کی خبر سنکر ارکان دولت کے ساتھ شہر سے بارہ [۱۲] کوس باہر استقبال کیلئے آیا، اور کمال عقیدت کے ساتھ شہر کے حصار کے جلوخانہ سے ایوان تک مولانا کی رکاب میں پیدل آیا، اور سلطان کے حکم کے مطابق مولانا کو دوبارہ طلائی سکوں سے وزن کرکے یہ رقم ان کے نذر کی، مولانا علاء الدین دہلوی نے جونپور آنے کے بعد علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت میں ایسی کوشش کی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں چوالیس [۴۴] مدرسے قائم ہوگئے اور ان کے غلغلہ سے پورا دیار پورب گونج اٹھا،

"در اندک ایام از یمن قدم مولانا چہل و چہار مدرسہ در شہر جون پور و حوالی از مدرسان و طالبان علم آراستہ شد"

مولانا کا یہ علمی کارنامہ دس سال سے بھی کم مدت میں انجام پایا، وہ جونپور ہی میں ۸۰۲ھ میں فوت ہوئے، اور شہر کے جنوب میں بیرون حصار دفن کئے گئے،[۱]

۷۹۶ھ میں تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری بادشاہ سلطان محمود شاہ تغلق نے اپنے باپ کے وزیر ملک سرور خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دیکر جونپور کی فرمانروائی عطا کی، وہ اپنے ساتھ دہلی سے مولانا شرف الدین لاہوری کو جونپور لایا، اور ان دونوں نے شاہزادہ فتح خاں اور مولانا علاء الدین کے کام کو آگے بڑھایا، تذکرۃ العلماء میں طبقات ناصری کے حوالہ سے ہے کہ مولانا شرف الدین لاہوری

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۱۰ و ۱۱

اشرف الشرفاء اور افضل الفضلاء تھے، فضائل صوری و معنوی کے جامع اور عالم باعمل و عامل باعلم تھے، ۷۹۶ھ میں سلطان محمود شاہ نے خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دیکر کشور مشرق کی فرمانروائی کا پروانہ دیا تو وہ مولانا شرف الدین کو بڑی عقیدت و ارادت سے لاہور سے بلا کر سلطان محمود شاہ کے حضور میں لے گیا، اور ملک العلماء کا خطاب دیکر اپنے ہمراہ جونپور لایا، خواجہ جہاں نے یہاں آکر یحییٰ منزل کو توڑ کر بدیع منزل کے نام سے عمارت بنوائی اور اس کے پہلو میں مولانا شرف الدین کے لئے مسجد مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کی، وہ مولانا سے استفادہ کے لئے خود مدرسہ میں آتا تھا، اور ان کی امامت میں ان کی مسجد میں نماز پڑھتا تھا، مولانا [illegible] میں جونپور میں فوت ہوئے، ان کی وصیت کے مطابق لاش جونپور سے لاہور پہنچائی گئی، ان کے بڑے صاحبزادے امیر صدر الدین علم و فضل کے ساتھ دولت و ثروت کے بھی مالک تھے، خواجہ جہاں کے بعد سلطان مبارک شاہ شرقی کے وزیر بنے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دور میں وزارت چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے، پھر سلطان کی اجازت سے مکہ مکرمہ چلے گئے، اور وہیں فوت ہوئے، ان کی تصانیف میں شرح کافیہ، حاشیہ شرح عضدی اور حاشیہ شرح تفسیر بیضاوی وغیرہ ہیں[1]۔

درحقیقت سرزمین پورب کا سارا علمی افتخار ان ہی چاروں کا مرہون منت ہے، جن میں دو امراء اور دو علماء شامل ہیں، اور ان ہی عناصر اربعہ سے یہاں کا علمی مزاج بنا ہے، اس پچیس سالہ دور میں باہر کے کئی علمی خانوادے دیار پورب میں آکر مستقل سکونت پذیر ہوئے جن میں صدیوں تک علم و فضل کا چرچا رہا، ان میں شیخ مخدوم ظہیر الدین

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۱ و ۱۲،

صدیقی متوفی ۲۷ ذوالحجہ ۸۴۵ھ محمد آباد گوہنہ میں آباد ہوئے، ان کی ولادت تاج پور سارن میں ہوئی تھی، شیخ ابو الفتح رکن الدین ملتانی سے خرقۂ خلافت پایا تھا، ان کے صاحبزادے مخدوم جمال الدین بن ظہیر الدین ان کے سجادہ نشین ہوئے، اور ان کے بعد شیخ داؤد بن شیخ جمال الدین ابن شیخ ظہیر الدین کو ولایت و خلافت ملی، ان تینوں کی قبریں محمد آباد کے مغرب میں سڑک کے شمال جانب ٹیلہ پر آستانہ روضہ میں ہیں، جس پر گنبد ہے، اسی سے متصل ایک مسجد بھی ہے، اسی خانوادۂ ظہیریہ سے شیخ محمد ماہ تھے، جو مبارکپور سے متصل مقام املو میں جاگیر پاکر سکونت پذیر ہوئے، ۸۲۶ھ کے کاغذات کشتواری میں ان کی جاگیر کا ذکر موجود ہے،

فیروز شاہ تغلق بانی جونپور کے دور میں ایک اور بزرگ محمد آباد گوہنہ میں آئے جن کے خاندان میں کئی اہل علم پیدا ہوئے، مولوی عبد الاحد ظفرآبادی نے مظہر الاحدیہ میں لکھا ہے کہ شیخ خلیل اللہ فاروقی بعہد تغلق باہر سے دہلی آئے اور ان کے بیٹے شیخ بایزید جونپور آئے جو نیا نیا آباد ہوا تھا، اور ارباب علم و فن کا مرکز بن رہا تھا، جونا خاں (سلطان فیروز شاہ تغلق بانی جونپور) نے ان کو پرگنہ محمد آباد میں کوڑیا پار، کبیر پور، اور چک میر کی جاگیر دی، ان کے بیٹے شیخ جمال الدین نے محمد آباد میں سکونت اختیار کی، ان کے بیٹے شیخ محمد اعظم سلاطین شرقیہ سے وابستہ رہے، ان کو قیام پور کا علاقہ جاگیر میں ملا، انھوں نے اپنے والد کے نام پر موضع جمال پور بسایا، ان کے تین بیٹے تھے، شیخ دریائی خاں شیخ کبیر خاں اور شیخ گدائی خاں، یہ لوگ تیموری دور حکومت میں برسراقتدار رہے اور کبیر پور اور جمال پور میں کوٹ اور قلعے اور کنوئیں تعمیر کئے، شیخ سعد اللہ نبیرہ شیخ گدائی خاں کے بعد جاگیر پر دوسروں نے قبضہ کر لیا، مگر غلام علی پسر گدائی خاں نے اسکو دوبارہ حاصل لیا، یہ راجہ اعظم شاہ بانی اعظم گڈھ کے نائب دیوان تھے، اور ان کے برادر نسبتی

شاہ بدر عالم راجہ اعظم شاہ کی دیوانی میں عہدہ دار تھے، شیخ سعد اللہ بن شیخ گدائی کے تین بیٹے تھے، جن میں سے حضرت شیخ غلام فرید صاحب علم و فضل اور سب میں ممتاز تھے، انھوں نے ملا نظام الدین فرنگی محلی متوفی ۱۱۶۱ھ سے تعلیم پائی تھی، ان کے زمانہ میں نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور نے چکلہ اعظم گڈھ کے دو تپوں پر قبضہ کر لیا تھا، ان کے والد شیخ عبد اللہ شیوخ محمد آباد میں سے تھے، اور ماں کسی معمولی خاندان سے تھیں، نواب فضل علی خاں نے مولانا غلام فرید سے چکلہ اعظم گڈھ پر قبضہ کے لئے دعا کی درخواست کی، مگر انھوں نے منظور نہیں کی،

"ہماں فضل علی خاں دو تپہ از چکلہ اعظم گڈھ بقبضۂ خود آوردہ، بآنحضرت عریضہ نوشت کہ تمنائے حکومت مستقل چکلہ دارم، بہ ہمت بزرگانہ امداد فرمایند، آنحضرت بجواب او این بیت نوشتہ فرستاد،

مسکین خرے آرزوئے دم کرد
نایافتہ دم، دو گوش گم کرد[1]

شرقی دور میں علم و علماء | ۷۷۲ھ سے ۷۹۶ھ تک کے تقریباً پچیس سالہ دور میں تغلق خاندان کے سلاطین کی توجہ سے جونپور اور دیار پورب میں علم و علماء کی آمد آمد ہوئی، اسی دور میں اس دیار کے سیاسی و ملکی حالات نے کروٹ لی، اور یہاں ایک آزاد و تازہ دم مسلم سلطنت کا قیام ہوا اور دہلی کی مرکزی حکومت کی ابتری نے پورب میں نیا رنگ دکھایا، طبقات اکبری میں ہے کہ ارباب تواریخ متفق ہیں کہ جب سلطان محمد تغلق شاہ کی سلطنت کا آفتاب سمت الراس سے گذر کر مائل بہ مغرب ہوا تو پورے قلمرو میں

[1] منظر الاحدیہ ص ۱۵۱ و ۱۵۲ مطبع کاظمی کانپور ۱۳۳۲ھ

خلل و اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی، سپاہ اور فوج میں جذبہ نفرت و بغاوت نے سر اٹھایا اور طرح طرح کے فتنے ظاہر ہوئے، اس کا سبب یہ تھا کہ سلطنت کے اہم عہدوں پر چھوٹے لوگ قابض و دخیل ہو کر ہوا و ہوس میں مبتلا ہوگئے جس سے بڑے اور ذمہ دار لوگ بد دل ہوگئے[1]، ان ہی حالات میں تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری حکمراں سلطان محمود شاہ کے زمانہ میں اس کے فرستادہ حاکم جونپور خواجہ جہاں ملک سرور نے ۷۹۶ھ یا ۷۹۵ھ میں اپنی مستقل حکومت کا اعلان کر کے "سلطان الشرق" کا خطاب اختیار کیا، سلاطین شرقیہ جونپور میں حسب ذیل چھ سلاطین ہوئے (۱) سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک سرور از ۷۹۶ھ تا ۸۰۲ھ مدت چھ سال چند ماہ (۲) سلطان مبارک شاہ شرقی (ملک قرنفل متبنّٰی خواجہ جہاں ملک سرور) از ۸۰۲ھ تا ۸۰۴ھ مدت ایک سال چند ماہ (۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی برادر خورد مبارک شاہ از ۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ مدت چالیس ۴۰ سال چند ماہ (۴) سلطان محمود شاہ شرقی پسر سلطان ابراہیم شاہ از ۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ مدت اٹھارہ سال چند ماہ (۵) سلطان محمد شاہ شرقی پسر سلطان محمود شاہ از ۸۶۲ھ تا ۸۶۲ھ مدت پانچ ماہ (۶) سلطان حسین شاہ شرقی پسر سلطان محمود شاہ از ۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ مدت انیس ۱۹ سال،

شرقی سلطنت کی حدود طبقات اکبری کے بیان کے مطابق دہلی کی جانب پرگنہ کول اور ابری تک، بہار کی جانب ترہت تک، اور شمال کی جانب بہرائچ تک، سلطان الشرق خواجہ جہاں نے خود مختاری کے بعد پرگنہ کول و کمپیلہ و بہرائچ کو زیر کیا، اور بنگال (لکھنوتی) کے راجوں مہاراجوں سے ہاتھیوں کا تحفہ جاری کرا

[1] طبقات اکبری ص ۲۰۶،

جو شاہان تغلق کے زمانہ میں بند ہو گیا تھا۔[1]

جونپور کی بنیاد کا خمیر کا علمی تھا، پہلے ہی دن سے علم و علماء کا ماوی و ملجا بنا، اور پچیس۲۵ سال کے بعد یہاں جو سلطنت قائم ہوئی اس کا مزاج بھی سراسر علمی تھا، اور اس کے حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں علم و علماء کی بہترین خدمت کی، اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کا پہلا حاکم شاہزادہ فتح خاں اپنے ساتھ مولانا علاء الدین دہلوی کو جونپور لایا تھا، جن کے ہمراہ چار سو طالب علم آئے تھے، اور جنھوں نے قلیل مدت میں چوالیس۴۴ مدرسے جاری کئے، اسکے بعد ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں کو یہاں کی حکومت ملی تو اس نے مولانا شرف الدین لاہوری کو جونپور لاکر ان کے لئے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ بنوائی، اور شرقی سلطنت قائم کرنے کے بعد بھی ان سے استفادہ کرتا رہا، اور جب ۸۰۰ھ میں ان کا وصال ہو گیا، تو ان کے صاحبزادے مولانا صدر الدین درباری علماء میں ممتاز شخصیت کے مالک رہے، خواجہ جہاں کے بعد جب اس کا منہ بولا بیٹا سلطان مبارک شاہ تخت نشین ہوا، تو اس نے مولانا موصوف کو وزارت عطا کی اور اپنے مختصر دورِ حکومت میں ان کو ہر طرح سے نوازا جونپور کی تاسیس (۷۷۲ھ) سے لے کر شرقی سلطنت کے پہلے حکمراں کے آخری زمانہ ۸۰۲ھ تک دیارِ مشرق میں علم و علماء کی تازہ بہار آتی رہی، اس دور میں جب دہلی کا مرکز حوادث و فتن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اور وہاں کی علمی اور دینی محفلیں اجڑ اجڑ کر دوسرے دیار و امصار کی طرف منتقل ہو رہی تھیں، جونپور دار العلم، دار الامان اور دہلی ثانی بن رہا تھا، ایک صدی قبل تاتاریوں کے قتل و غارت کے اثرات پورے مشرقی عالم اسلام میں باقی ہی تھے کہ ۸۰۱ھ میں تیموری فتنہ نے سر اٹھایا، اور وسط ایشیا کو روندتا

---

[1] طبقات اکبری ص، ۲۷۵،

ہوا ۸۰۱ھ میں دہلی پہنچ گیا، جس سے وہاں کے اہل علم پریشانی میں مبتلا ہو گئے، ادھر جونپور امن و امان اور علم و علماء کا گہوارہ بن رہا تھا، ان حالات میں خاص طور سے دہلی کے دوسرے علماء و فضلاء اور ان کے تلامذہ و مسترشدین نے جونپور کا رخ کیا، اور دہلی کی تباہی کے نتیجہ میں جونپور کی آبادی ہوئی، مصائب قوم عند قوم فوائد،

شرقی سلطنت کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس۴۰ سالہ دورِ سلطنت اس کا عہد زریں اور پورب میں علمی بہار کا زمانہ ہے اسکے مبارک و مسعود عہد میں مختلف دیار و امصار کے ارباب علم و فضل جونپور کے دار الامان میں پناہ گزیں ہوئے، سلطان موصوف مورخوں کے بیان کے مطابق گرویدۂ مشائخ و فقراء، محب علم و علماء، عدل پرور، رعایا نواز اور خدا ترس بادشاہ اور اس کا دورِ سلطنت نہایت بابرکت تھا، مولانا نظام الدین احمد بن مقیم ہروی نے طبقات اکبری میں اس عہد زریں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

بعد از وفات مبارک شاہ امرائے دولت شرقی برادر کہتر او را سلطان ابراہیم خطاب دادہ بر تخت سلطنت و اورنگ حکومت اجلاس نمودند و طبقات انام در مہد امن و امان قرار گرفتند علماء و بزرگان کہ از آشوب جہاں پریشان خاطر بودند بجونپور کہ دراں ایام دار الامان بود سر برآوردند

سلطان مبارک شاہ شرقی کی وفات کے بعد امرائے دولت نے اس کے چھوٹے بھائی کو سلطان ابراہیم کا خطاب دیکر تخت سلطنت پر بٹھایا اور عوام نے امن و امان کے گہوارے میں سکون پایا، جو علماء اور مشائخ آشوب جہاں سے پریشان خاطر تھے، جونپور آگئے، جو اس وقت دار الامان تھا، دار السلطنت جونپور علماء کی آمد سے دار العلم بن گیا، او

وآں دار السلطنت از فر قدوم علماً
دار العلم گردید، وچندیں کتب ورسائل
بنام او تصنیف شد، مثل حاشیہ ہندی
وبحر المواج وفتاویٰ ابراہیم شاہی، و
ارشاد وغیرہ ذلک، چوں عون الٰہی قرین
آں بادشاہ بود، لاجرم در عنفوان دولت
تجارب وکامرانی از جمیع سلاطین ہند
در مضمار معانی قصب السبق ربودہ،[1]

کئی کتب ورسائل سلطان ابراہیم
کے نام سے تصنیف ہوئے، جیسے
حاشیہ ہندی، بحر المواج، فتاویٰ
ابراہیم شاہی اور ارشاد وغیرہ
چونکہ توفیق خداوندی اس بادشاہ
کا ساتھ دے رہی تھی اس لئے
وہ امور سلطنت کے تجربات اور مقاصد
کی کامیابی میں ہندوستان کے تمام بادشاہوں

محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے:-

اما شاہے بود متصف بعقل ودانش
وتدبیر در عصر وے فضلاے ممالک ہندوستان
ودانشمندان ایران وتوران کہ از
آشوب جہاں پریشان خاطر بودند بدار الامان
جونپور آمدہ در مہد امن وامان غنودند،
واز خوان احسان او ذلہا برداشتہ بنام
نامی او چنانچہ بزبان قلم خواہد آمد چندیں
کتب ورسائل پرداختند، امراء ووزراء
صاحب عقل وسیاست وشجاعت در دولت

سلطان ابراہیم شاہ شرقی عقل ودانش اور تدبیر
کے اوصاف سے متصف تھا، اس کے دور میں
ہندوستان کے مختلف شہروں کے فضلا اور ایران
وتوران کے ارباب علم ودانش جو آشوب جہاں
سے پریشان خاطر تھے، جونپور میں آکر امن وامان
کے گہوارے میں آرام سے سوئے، اور اس کے
دسترخوان کرم سے بہرہ ور ہوئے، اور اسی کے
نام سے کئی کتب ورسائل لکھے، عقل وتدبیر
اور سیاست وشجاعت رکھنے والے امراء اور

[1] طبقات اکبری ص ۵۲۶،

خانہ او جمع شدہ مثل درگاہ سلاطین
ایران رنگین گردید،

وزراء اسکے دربار میں جمع ہوئے جن کی وجہ سے اسکا دربار
سلاطین ایران کے دربار کی طرح پرکشش اور رنگین ہوگیا تھا،

جہاں آفریں تا جہاں آفریں
چو او مرزبانے نیاید پدید

جہاں آفریں تا جہاں آفریں،
چو او مرزبانے نیاید پدید

۸۱۶ھ میں آخری بار ابراہیم شاہ شرقی دہلی کی تسخیر کیلئے چلا مگر راستہ سے لوٹ آیا اور اپنی توجہ ملک اور رعایا کی خدمت، امن وامان کی بحالی، عدل وانصاف کی فراوانی، علماء وفضلاء اور مشایخ کی خبر گیری پر مرکوز کر دی، فرشتہ میں لکھا ہے:-

وبعد از کوچ چند از راہ برگشتہ
بدار العلم جونپور آمد وبصحبت علماء ومشائخ
وتعمیر ولایت، وتکثیر زراعت مشغول شد
سالہا ہیچ طرف سواری نفرمود، ومردم
از اطراف واکناف ہندوستان کہ مشحون
از خلل شدہ بود روئے بجونپور آوردہ
ہر یک فراخور مرتبت وحالت نوازش
می یافتند، واز خادم ومشائخ وعلماء و
سادات ونویسندہ از ہر حیثیت بجائے
رسید کہ جونپور را دہلی ثانی می گفتند،
ودکوچک وبزرگ آں دیار وجود شاہ

چند بار دہلی کی تسخیر کے ارادے سے کوچ
کرنے کے بعد سلطان ابراہیم دار العلم جونپور
میں واپس آکر علماء وفضلاء کی صحبت، ملک
کی تعمیر اور زراعت کی تکثیر میں مشغول ہوگیا
اور کئی سال تک باہر نہیں نکلا، اس درمیان
میں ہندوستان کے مختلف دیار کے لوگ
پریشان حالی وبے چینی کی وجہ سے جونپور
چلے آئے اور اُن میں سے ہر ایک نے اپنی
حیثیت کے مطابق شاہی نوازش سے حصہ
پایا، معمولی درجہ کے خدام سے لیکر علماء ومشائخ،
سادات اور لکھنے پڑھنے والے عہدے اور منصب

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۵،

ابراہیم شاہ شرقی از جملہ مغتنمات شمردہ دورۂ حیات را بنشاط و انبساط می گذرانیدند، از شاہ گرفتہ تا گدا با تمام خوش وقت بودند، حزن و اندوہ از دیار بستہ بود،

(تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۷)

یوں نوازے گئے کہ جونپور دہلی ثانی کے نام سے مشہور ہوگیا، اور تمام چھوٹے بڑے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ذات کو غنیمت جان کر دو دن کی زندگی کو نشاط و انبساط کے ساتھ بسر کرنے لگے، شاہ و گدا خوش وقت تھے اور اس دیار سے رنج و غم اپنا بوریا بستر لپیٹے ہوئے تھا،

.. ..

ابراہیمی دور میں تمام اطراف کے علماء و مشائخ کھینچ کھینچ کر جونپور آگئے اور ہندوستان کے علم کا خلاصہ یہاں جمع ہوگیا، قاضی شہاب الدین دولت آبادی، قاضی نصیر الدین دہلوی، شیخ ابو الفتح بن عبد الحی بن مولانا عبد المقتدر شریحی کندی دہلوی، شیخ نصیر الدین ابن نظام الدین غزنوی دہلوی، مولانا قیام الدین دہلوی ظفر آبادی، شیخ محمد عیسیٰ دہلوی جونپوری، شیخ فتح اللہ اودھی انصاری، شیخ محمد بن خضر دہلوی وغیرہ نے بڑے اطمینان و سکون سے تعلیم و تدریس، ارشاد و تلقین، ذکر و شغل اور رشد و ہدایت میں مشغول ہوئے، اور ان کے خانوادے کئی صدیوں تک معدنِ علم و فضل رہے،

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کو غایت عقیدت اور کمال محبت سے جونپور آنے کی دعوت دی، اور اپنے خاص نمایندوں کو ہدایا و تحائف دیکر ان کی خدمت میں بھیجا، قاضی صاحب علماء و فضلا اور طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے، سلطان نے بڑھکر استقبال کیا، اور جامع مسجد (اٹالہ مسجد) کے پہلو میں ان کے لئے مدرسہ اور مکان بنوایا، فرشتہ کا بیان ہے، کہ سلطان نے قاضی صاحب

کی توقیر و تنظیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، خاص خاص تقریبوں میں قاضی صاحب کو شاہی دربار میں چاندی کی کرسی پر بٹھاتا تھا، ایک مرتبہ قاضی صاحب بیمار پڑے تو سلطان مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر گیا، اور پانی کا بھرا ہوا ایک پیالہ لے کر قاضی صاحب کے سر پر گھمایا اور یہ کہہ کر پانی پی گیا کہ بار خدایا جو مصیبت ان پر آنے والی ہو، اسے میرے نصیب میں کر کے ان کو شفا دیدے، اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس صاحبِ تخت و تاج کو شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے علماء سے کس قدر انسیت و محبت تھی،[1]

تذکرۃ العلماء میں ہے کہ ایک مرتبہ قاضی عبد المقتدر شریحی نے دہلوی نے اپنے تلمیذ رشید قاضی شہاب الدین کی خواہش اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے شوق زیارت پر جونپور کا قصد فرمایا، قاضی شہاب الدین اور سلطان ابراہیم سیکڑوں علماء و فضلاء، ہزاروں طلبہ، شہزادوں اور ارکانِ دولت کو لیکر بارہ کوس تک پیشوائی کے لئے نکلے، سلطان نے جب دیکھا کہ قاضی صاحب اپنے استاد کی رکاب میں پیدل چل رہے ہیں تو خود بھی گھوڑے سے اتر پڑا، آگے بڑھے تو شاہی اصطبل کے تین گھوڑے موجود تھے، سلطان نے قاضی عبد المقتدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک گھوڑے پر بٹھایا، دوسرے پر قاضی شہاب الدین سوار ہوئے، اس کے بعد سلطان سوار ہوا، اور تینوں ساتھ روانہ ہوئے، جہاں راستہ تنگ ہوتا تو سلطان دونوں عالموں کو آگے کرتا اور خود ان کے پیچھے چلتا اسی ترتیب سے شہر میں داخل ہوئے، جلو خانہ سے لیکر ایوان شاہی تک انواع و اقسام کے طلا بافت کپڑے بچھائے گئے تھے، قصر شاہی کے قریب پہنچے

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۷،

تو سلطان نے قاضی عبد المقتدر کی رکاب پکڑ کر ان کو اتارا اور شاہی مسند پر بٹھا کر خود قاضی شہاب الدین کے ساتھ خدمت میں کھڑا رہا، اس موقع پر جو شاہی ہدایا و تحائف پیش کیے گئے ان کی مجموعی قیمت ایک لاکھ سے زیادہ تھی، قاضی عبد المقتدر ایک سال تک اسی اعزاز و اکرام کے ساتھ جونپور میں مقیم رہے، ہر ہفتہ ایک دن محفل وعظ منعقد ہوتی تھی، جس میں سلطان ابراہیم، شاہزادے، بیگمات اور ارکان دولت شریک ہوتے اور صدہا غیر مسلم مشرف با سلام ہوتے تھے، اور عوام زار و قطار روتے تھے، ایک سال کے بعد قاضی عبد المقتدر نے ضعف اور پیری کا عذر کر کے سلطان سے دہلی جانے کی اجازت چاہی، اور سلطان کی درخواست پر اپنے صاحبزادے شیخ عبد الواحد کو جونپور میں چھوڑ کر خود دہلی تشریف لے گئے[۱]، تذکرۃ العلماء کا یہ بیان قاضی عبد المقتدر سے متعلق محلِ نظر ہے، کیونکہ ان کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی ہے، جب کہ شرقی سلطنت کا قیام بھی نہیں ہوا تھا، اور اس کا تیسرا حکمراں سلطان ابراہیم ۸۰۴ھ میں تخت نشین ہوا ہے، اس لیے اس کا تعلق کسی دوسرے نامور عالم سے معلوم ہوتا ہے،

مخدوم شیخ احمد عبد الحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ ابراہیمی دور کے اکابر اولیاء اللہ میں ہیں، ایک مرتبہ سلطان ابراہیم شاہ قصبہ ردولی گیا، تو شیخ احمد عبد الحق نے ملاقات کرنی چاہی، اور فرمایا کہ الناس علیٰ دین ملوکھم کے رو سے ابراہیم مسلمان بادشاہ ہے اس کی رعایا کو مسلمان رہ کر اس کی محبت کا دم بھرنا چاہیے، جب لشکر شاہی کے قریب پہونچے تو قاضی رضی نے بڑھ کر استقبال کیا، اور ان کو اپنی قیام گاہ میں ٹھہرا کر سلطان سے کہا کہ ایک درویش جو قطب وقت ہے، ملاقات کے لیے آیا ہے، سلطان ابراہیم

---

[۱] تذکرۃ العلماء ص ۱۷،

شاہ نے کہا کہ میں خود ان سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں، قاضی رضی نے کہا کہ رات میں ان سے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، پہلے ان کی خدمت میں کچھ نذر کرنا چاہیے، اگر قبول کر لیں گے تو سلطان کا ملنا مناسب ہوگا، سلطان کو یہ بات پسند آئی، اور فوراً ردولی کے علاقہ میں چار گاؤں اور ہزار بیگھہ زمین جاگیر میں دینے کا حکم دیا، قاضی رضی پروانہ اور کچھ نقدی لیکر شیخ احمد عبد الحق کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ سلطان نے یہ نذر پیش کی ہے، شیخ صاحب نے قاضی رضی سے فرمایا،

تو و ابراہیم خدایان دیگر پیدا شدہ اند	تم اور ابراہیم کیا دوسرے خدا ہو گئے ہو
کہ دعویٰ رزاقی می کنند، خدائے کہ	جو رزاقی کا دعویٰ کرتے ہو، جو خدا ابراہیم
ابراہیم را، و حشم ابراہیم او اسپان ابراہیم	اور اس کے ملازموں، گھوڑوں اور ہاتھیوں
را و فیلان ابراہیم را رزق می دہد	کو روزی دیتا ہے، اور تمکو، تمہارے نوکروں اور
(ترا) و اسپان ترا و حشم ترا رزق می دہد	گھوڑوں کو روزی دیتا ہے کیا وہ مجھے کہ اسکے
منکہ یک فقیر درگاہ اویم فرزندان مرا	در کا فقیر ہوں، اور میرے لڑکوں کو روزی
رزق نخواہد داد، کہ تو و ابراہیم درمیان	نہیں دے گا، جو تم اور سلطان درمیان
آیندہ،	میں آتے ہو؟

اس کے بعد اپنے خادم بختیار سے مخاطب ہو کر کہا،

کنواں ہوئے تو پاٹوں سمندر کہ پاٹن جائے	بارا ہوئے تو برجوں جھیل کہ برجن جائے

اور سلطان سے ملاقات کیے بغیر راتہی کو واپس چلے گئے[۵]،

ایک مرتبہ شیخ احمد عبد الحق جونپور تشریف لے گئے، اور سلطان ابراہیم سے ملاقات

---

[۵] انوار العیون فی اسرار المکنون ص ۳۱، ۳۲،

فرمائی، دربار میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی موجود تھے، شیخ اور سلطان میں گفتگو ہو رہی تھی، قاضی صاحب نے کسی بات میں دخل دیدیا، مگر بعد میں معذرت کی، جب یہ بات میر صدر جہاں سید اجمل کو معلوم ہوئی تو انھوں نے قاضی صاحب سے کہا کہ اگر سلطان ابراہیم اور شیخ احمد عبد الحق میں ملاقات ہو گئی، تو پھر ہم لوگوں کو یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیے کہ سلطان ہم پر یا شاہی امور پر توجہ دے سکیں گے، یہ درویش صاحب حال اور اہل کمال ہیں، ان کی نظر کیمیا اثر سے تانبا سونا بن جاتا ہے،[1]

میر صدر جہاں سید اجمل شریعت و طریقت کے جامع، علوم و معارف کے حامل اور ورع و تقویٰ میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، سلطان ابراہیم ان سے بیحد عقیدت و محبت رکھتا تھا انکو صدر جہاں کے منصب پر ممتاز کیا اور انکے لئے دریا کے کنارے نہایت خوبصورت مسجد بنوائی جو آج بھی جھجری مسجد کے نام سے موجود و مشہور ہے، سلطان کا ایک شاہزادہ بھی ان کی خانقاہ کے جوار میں دفن ہے،[2]

شیخ عیسیٰ دہلوی کو سلطان ابراہیم شاہ نے کمال آرزو سے دہلی سے جونپور بلایا، وہ اپنے چاروں فرزندوں یعنی خواجہ احمد، خواجہ محمد، خواجہ حامد اور خواجہ محمود کے ہمراہ یہاں تشریف لائے، سلطان ان کے ساتھ بڑی عقیدت سے پیش آیا، اور بہت کچھ مال و متاع سے نوازنا چاہا، مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، البتہ سلطان نے ان کے لئے ایک خانقاہ بنوا دی، جس میں متوکلانہ زندگی بسر کرکے تلامذہ و مریدین کی علمی و دینی خدمت اور ان کی تعلیم و تربیت کا کام انجام دیتے رہے، سلطان ہر ہفتہ شاہزادوں کے ساتھ انکی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اور فیض اٹھاتا تھا[3]

شیخ محمد بن خضر متوفی ۸۱۱ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور آئے، اور ایک میدان

---

[1] انوار العیون ص ۳۳ [2] تجلی نور ج ا ص ۳۵ [3] تذکرۃ العلماء ص ۲۰،

میں درخت کے سایہ میں فروکش ہوئے، سلطان ابراہیم کو ان کی خبر ملی تو کمال عقیدت سے ان کے لئے مکان کا انتظام کیا، اور پورے اعزاز و احترام کے ساتھ رکھا، اور انکے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد گہنہ میں قریہ ولید پور وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیئے، بعد میں شیخ مشید کا خاندان وہیں منتقل ہو گیا، جس میں شاہ ابو سعید، شاہ ابو الخیر، شاہ اسمٰعیل، ملا محمود، شاہ ابو الغوث اور شاہ ابو اسحٰق وغیرہ پیدا ہوئے[1]

اسی دور میں شیخ فتح اللہ بن عبد اللہ انصاری اودھی دہلی سے جونپور آئے، وہ جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے، جس میں امراء و اعیان بھی شریک ہوتے تھے، قاضی وقت نے جامع مسجد میں ان سے ملاقات کی، اور ان کے وعظ میں برابر حاضر ہوتا رہا، بعد میں ان کو پرگنہ ماہل میں کئی گاؤں جاگیر میں ملے، جہاں شیخ فتح اللہ منتقل ہو گئے، اور اس کے قریب اپنے لڑکے کے نام پر بہاء الدین پور ایک گاؤں بسایا، پھر کند عیار کے نام سے دوسرا گاؤں بسایا، ان کی اولاد میں علمی سلسلہ چلتا رہا، آخری دور میں شیخ گلشن علی بن شیخ عطاء اللہ ماہلی متوفی حدود ۱۲۰۰ھ اور مولوی حسن علی بن شیخ نوازش علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ پیدا ہوئے،[2]

اسی دور میں ایک بزرگ شیخ عبد الحکیم اپنے دس لڑکوں کے ساتھ وارد جونپور ہوئے، سلطان ابراہیم نے ان کی بھی آؤ بھگت کی اور کئی مواضعات جاگیر میں دیئے، ان کے لڑکے سلطان کے اونچے عہدوں پر فائز ہوئے، خود شیخ عبد الحکیم کو سلطان کی طرف سے خان کا خطاب ملا، اور نتھو پور (گھوسی) وغیرہ کئی پرگنوں کے مدار المہام مقرر ہوئے، انھوں نے منجھولی سے لیکر بہار تک کے علاقوں کا نہایت عمدہ نظم و نسق

---

[1] تجلی نور ج ا ص ۸۴ وغیرہ، [2] تذکرۂ صبح وطن ص ۵۰ و تاریخ الافکار ص ۲۲ وغیرہ،

قائم کیا اور وہاں سلطان کے نام کا سکہ جاری کیا، بعد میں ان کی اولاد نتھوپور عرف سیاہ میں آباد ہو گئی، اور جب آخری شرقی بادشاہ سلطان حسین شاہ کو سکندر لودی نے شکست دی اور نظام سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی تو تہالی سرکشوں نے شیخ عبدالحکیم اور ان کے کئی لڑکوں کو قتل کر ڈالا، شاہ ابو الغوث گرم دیوان بھیروی اہراوی کی والدہ اسی خاندان سے اور شیخ میر جان صدیقی کی صاحبزادی تھیں[1]،

شیخ عیسٰی کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے، ان کے فرزند حضرت شیخ محمد بن عیسٰی تاج جونپوری متوفی [illegible]ھ علمائے ربانیین اور اولیائے کاملین میں سے تھے، سلطان ابراہیم شاہ اور اس کے بیٹے سلطان محمود شاہ دونوں ان سے انتہا درجہ کی عقیدت و محبت رکھتے تھے، ایک مرتبہ سلطان ابراہیم نے کمال عقیدت سے ان کی خدمت میں بڑے قیمتی کپڑے بھیجے، شیخ محمد بن عیسٰی تاج نے ان کے لینے سے انکار کر دیا اور یہ اشعار پڑھے،

من دلق خود با طلس شاہاں نمی دہم	من فقر خود بملک سلیمان نمی دہم
از رنج فقر در دل گنجے کہ یافتم	این رنج را براحت شاہاں نمی دہم

شیخ محمد بن عیسٰی جمعہ کی نماز [illegible] کی مسجد خالص مخلص میں پڑھتے تھے، بڑھاپے تک ان کا یہی معمول رہا، ایک مرتبہ سلطان محمود نے ان کی پیری اور کمزوری دیکھ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو آپ کی خانقاہ کے قریب ایک مسجد تعمیر کرادی جائے اور آپ کی اجازت سے سلطان نے جامع مسجد جامع الشرق کی تعمیر شروع کی، جس کی تکمیل سلطان حسین شاہ نے کی[2]،

---

[1] مناقب غوثی باب ششم قلمی [2] تجلی نور ج ۱ ص ۲۳،

سلطان ابراہیم کے فقراء و مشائخ سے ہر حال میں حسن ظن رکھنے کے سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ شیخ رکن الدین بن مخدوم شیخ صدر الدین سہروردی جونپوری متوفی [illegible]ھ سے ایک مرتبہ خلاف شرع کوئی فعل سرزد ہو گیا، قاضی القضاۃ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے اس پر سخت نکیر کی، اور اپنے شاگرد شیخ عبد الملک عادل کو تنبیہ کے لئے بھیجا، مگر وہ شیخ رکن الدین کی مشیخت کے مقابلہ میں اپنی عاقبت سے کام نہ لے سکے، اور انکے ہمنوا بن گئے، اس لئے قاضی صاحب نے کوتوال شہر نصرت خاں کو پروانہ لکھا کہ وہ شیخ رکن الدین کو شہر بدر کر دے، کوتوال نے بھی شیخ رکن الدین کی طرفداری کی اور سلطان ابراہیم سے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا مناسب ہے، چنانچہ سلطان نے بھی چشم پوشی کر لی، ایک مرتبہ قلندروں کی ایک جماعت نے شیخ رکن الدین سے کچھ سوال کیا انھوں نے اپنے فرزند جلال کا ہاتھ پکڑ کر ان کے حوالہ کر دیا، اس واقعہ کی خبر سلطان ابراہیم کے وزیر عماد الملک قاضی خاں کو ہوئی تو انھوں نے قلندروں کو پانچ سو کی رقم دیکر جلال کو ان سے لے لیا اور شیخ رکن الدین کے گھر پہنچا دیا[1]،
(ناقی)

---

[1] تجلی نور ج ۱ ص ۳۳،

شرح السنۃ امام بغویؒ

از۔ ضیاء الدین اصلاحی

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ نے تین اشخاص کو حدیثوں کی شرح و توجیہ میں نہایت قابل اعتماد اور بے نظیر قرار دیا ہے[1]، ان میں دو امام خطابیؒ اور امام نوویؒ رحمۃ اللہ علیہ کی شرحوں کی خصوصیات معارف میں پہلے تحریر کی جاچکی ہیں۔ اس مضمون میں امام بغویؒ کی شرح السنۃ کا ذکر مقصود ہے۔

امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی (م ۵۱۶ھ) حدیث و فقہ اور تفسیر میں ید طولی رکھتے تھے، ان سہ گانہ علوم میں ان سے بیش قیمت اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، شرح و توجیہ حدیث میں شرح السنۃ بڑی جامع اور اہم کتاب ہے، شاہ عبد العزیز صاحبؒ فرماتے ہیں،

خصوصاً شرح السنۃ در فقہ حدیث و توجیہ مشکلات کافی و شافی است و گویا شرح مصابیح و مشکوۃ از آں کتاب حاصل است۔[2]

خاص طور سے امام بغویؒ کی شرح السنۃ فقہ حدیث اور حل مشکلات میں کافی و شافی ہے اور گویا مصابیح و مشکوۃ[3] کی شرح اس سے ہوجاتی ہے۔

زمانہ حال کے فاضل شعیب ارناؤوط تحریر کرتے ہیں۔

"یہ سنت و حدیث کی اہم اور سلف کی بہترین کتابوں میں ہے، ترتیب و تنقیح اور

۱؎ عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۰۔ ۲؎ ایضاً۔ ۳؎ مصابیح السنۃ بھی امام بغوی ہی کی تصنیف ہے، مشکوۃ کی ترتیب و تالیف اسی نہج پر کی گئی ہے۔

وثوق و اعتبار کے لحاظ سے اس کا پایہ نہایت بلند ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث، اس کے ناقلین، اس کی فہم و درایت اور علل نیز صحابہ و تابعین، ائمہ مجتہدین اور فقہائے امصار کے اقوال سے مصنف پوری طرح واقف اور نقل و تحقیق میں ہر طرح قابل اعتماد ہیں[4]"

۱۹۷۱ء میں اس کتاب کی ابتدائی پانچ جلدیں بیروت سے شعیب ارناؤوط اور محمد زہیر الشاویش کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ پہلی دفعہ شائع ہوئی ہیں، یہ مضمون انہی جلدوں کو پیش نظر رکھکر تحریر کیا گیا ہے، ان جلدوں میں ایمانؔ، علمؔ، طہارۃؔ، صلاۃؔ، فضائل قرآنؔ، ادعیہ اور جنائز کے جملہ ابواب اور زکوٰۃ کے چند ابواب شامل ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ بقیہ جلدیں بھی چھپ گئی ہیں یا نہیں؟

مصنف کے زمانہ کی دینی بے حسی نے ان کے دل میں شرح السنۃ کی جمع و تالیف کا داعیہ پیدا کیا، انھوں نے جب دیکھا کہ لوگوں کی توجہات فقہی کتابوں کی طرف زیادہ مرکوز ہوتی جارہی ہے، اور قرآن و سنت کے علوم اور ان کے معانی کی بحث و تحقیق سے دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے تو انھوں نے مسلمانوں کی خیر خواہی کا لازمی تقاضا اور اپنا یہ دینی حق سمجھا کہ ایک ایسی کتاب مرتب کریں جو روایت و درایت دونوں کی خصوصیات کا مجموعہ ہو اور اس کے ذریعہ لوگوں کو ان ائمہ سلف کے اقتداء کی دعوت دیں جنکو اللہ نے اسلام کا صحیح فہم، کتاب و سنت میں تفقہ و بصیرت اور ان کے اصول و ضوابط سے رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"گو سلف کی کتابیں کافی تھیں، تاہم اس کتاب کی جمع و ترتیب کا مقصد بھی

۴؎ مقدمہ شرح السنۃ ص ۳۔

ان کے افعال کی اقتدا اور اس رشتہ سے منسلک ہونا ہے، جس کا ایک سرا مصدر نبوت سے جڑا ہوا ہے، باوجودیکہ ان بزرگوں کے مقابلہ میں میری کوشش نہایت حقیر اور معمولی ہے۔ مگر میرا منشا اقامت دین اور احیاء سنت کی جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہونا ہے کیونکہ مجھے ان سے محبت اور ان کے طریقہ سے شغف ہے حدیث میں ہے کہ

المرئ مع من احب

آدمی انھیں لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جنکو وہ محبوب رکھتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ دین کے نشانات مٹ رہے ہیں۔ اور لوگوں پر ہوائے نفس کا غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ اکثر اہل زمانہ کے نزدیک باطل نے حق کی صورت اور جہالت نے علم کی شکل اختیار کرلی ہے، اور ٹھیک وہی کیفیت ہوتی جارہی ہے، جس کو رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا تھا کہ

ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا۔

بیشک اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ بندوں (کے سینوں) سے اسکو نکال لے بلکہ علماء کو موت دیکر علم کو اٹھائے گا یہاں تک کہ جب کسی عالم کو باقی نہ رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، پس ان سے (دینی مسائل) دریافت کئے جائیں گے اور وہ بغیر جانے بوجھے فتوے دیں گے، یہ لوگ[۱] خود بھی (گمراہ) ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اسی صورت حال نے مجھکو تجدید علم کے لیے آمادہ کیا تاکہ لوگوں میں تازگی اور بیداری

پیدا ہو، میرا حال اس شخص جیسا ہے، جس نے تاریکی میں چراغ روشن کیا ہوتا کہ بھٹکنے والے راہ یاب ہوجائیں، یقیناً سعی و کوشش کرنے والا خائب و خاسر نہیں ہوتا۔"[۱]

صحت و وثوق کے اعتبار سے اسکا درجہ بلند پایہ ہے کیونکہ مصنف نے معتبر کتابوں سے مستند حدیثیں نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے، چنانچہ خود رقمطراز ہیں۔

"اس میں وہی حدیثیں درج کی گئی ہیں جو ان ماہرین اور ائمہ فن کے نزدیک قابل اعتماد ہیں، جن کی حذاقت و امامت فن اپنے اپنے دور میں مسلم رہی ہے اور انھوں نے ان روایات کو اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ باقی جن مقلوب، موضوع اور مجہول حدیثوں کو انھوں نے نظر انداز کردیا ہے یا جنکو ترک کرنے پر انکا اتفاق رہا ہے ان سے میں نے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔"[۲]

علاوہ ازیں انھوں نے جن کتابوں سے وہی روایتیں لی ہیں جن کی سندیں ان کے مصنفین تک متصل ہیں اور عموماً خود بھی مکمل سندیں تحریر کی ہیں لیکن کہیں کہیں بعض اسناد نقل نہیں کئے گئے ہیں اس کا سبب انہی کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:۔

"میں نے جن حدیثوں کی سندیں نقل نہیں کی ہیں ان میں اکثر تو عام اور مشہور کتابوں میں درج ہیں اسلئے طوالت سے بچنے کیلئے میں نے انھیں ترک کردیا ہے کیونکہ ائمہ کے نقل پر مجھکو پورا اعتماد ہے۔"[۳]

مگر اس اہتمام اور سعی بلیغ کے بعد بھی ضعیف روایتوں سے یہ مجموعہ خالی نہیں ہے لیکن ان سے اسکی اہمیت و عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ عموماً مصنف نے ان کے ضعف کی وضاحت کردی ہے اور کہیں کہیں شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا کسی صحیح حدیث کے مجمل مفہوم کی توضیح و بیان کیلئے انھیں نقل کیا گیا ہے، بعض ابواب میں صحیح روایات نہ ہونے کی وجہ سے بھی اس طرح کی حدیثیں شامل کردی گئی ہیں۔

شرح السنۃ احادیث و روایات کا مجموعہ بھی ہے اور اس میں ان کی شرح و توضیح بھی کی گئی ہے اسکو موضوع اور مضمون کے

۱؎ شرح السنۃ ج ۱ ص ۲۰ ۲؎ ایضاً ص ۳؎ ایضاً

مرتب کیا گیا ہے یعنی کسی موضوع کی اس سے متعلق روایات ایک ہی جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔

چنانچہ پہلے وہ کتاب کے مطلق لفظ سے عنوان قائم کرتے ہیں جو متعدد احادیث اور ایک ہی طرح کے مختلف ابواب پر مشتمل ہوتی ہے ہر باب کے ماتحت ایسی حدیثیں لائی گئی ہیں، جو کسی خاص اور متعین مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں، امام بخاریؒ کی طرح امام بغوی نے بھی ابواب قائم کرنے میں بڑی دقت نظر اور خاص کاوش سے کام لیا ہے اور بعض جگہ امام بخاریؒ کے ابواب کے عنوانات ہی بعینہ درج کر دیے ہیں۔

اکثر کتب اور بعض ابواب کی ابتدا ان آیات قرآنی سے کی گئی ہے جو موضوع کے لحاظ سے مناسب ہیں ضمناً صحابہ و تابعین کے حوالہ سے ان کی جو تفسیریں منقول ہیں ان کو بھی تحریر کیا گیا ہے، حدیثوں کا متن تحریر کرنے کے بعد ان کی توثیق و تصحیح اور حوالے و ماخذ کی تعیین کی گئی ہے۔ مثلاً جو حدیثیں صحیحین سے لی گئی ہیں ان کے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ وہ متفق علیہ ہیں، اور اگر شیخین میں سے کسی ایک ہی نے اس کی تخریج کی ہے تو اس کی تصریح کرتے ہیں اور اگر دونوں بزرگوں کے روایت یا الفاظ میں کوئی فرق و اختلاف ہوتا ہے تو اس کی توضیح کرتے ہیں، تصحیح کا فیصلہ عموماً اکابر محدثین کے حوالہ سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں براہ راست خود اپنا فیصلہ بھی دیا گیا ہے۔

سندیں اور حدیثیں نقل کرنے اور انکی صحت یا ضعف کا حکم لگانے کے بعد وہ حدیث کی مختلف حیثیتوں سے تشریح و توجیہ کرتے ہیں، شرح میں مشکلات کو حل، غریب الفاظ کی تفسیر اور رواۃ کی قوت و ضبط یا ضعف و جرح کا ذکر کیا گیا ہے بعض روایات کے مختصر تراجم بھی دیے گئے ہیں، حدیثوں سے مستنبط احکام و مسائل، صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہ و اجتہاد کے اقوال و دلائل، حدیثوں کے اسرار و نکات، جمع و تطبیق، مختلف

حدیثی فوائد، تفسیر و قرأت اور لغت و ادب وغیرہ کی متعدد و مفید بحثیں تحریر کی گئی ہیں مصنف لکھتے ہیں:

"یہ کتاب حدیث کے مختلف علوم اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے اس میں ان کی مشکلات اور غریب الفاظ کو حل کیا گیا ہے اور وہ احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں جن پر وفاق و خلاف کا دارومدار ہے اور جن کی معرفت ضروری ہے۔"[1]

یہ سب خصوصیات آگے مثالوں کے ذریعہ واضح کیجائیں گی۔ پہلے مصنف کے طریقہ تالیف، طرز ترتیب اور انداز بیان وغیرہ کا اندازہ کرنے کے لیے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

کتاب کی ابتدا کتاب الایمان سے کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل آیتوں سے مزین ہے۔

(۱) هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (البقرہ - ۲-۳)	(یہ کتاب) خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے جو غیب میں رہکر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں جو ہم نے ان کو بخشا ہے۔
(۲) إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران - ۱۹)	بیشک اللہ کا اصل دین اسلام ہی ہے۔
(۳) وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (مائدہ - ۳)	اور میں نے تمہارے لیے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا۔
(۴) وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۸۵)	اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائیگا۔

[1] شرح السنۃ ج ۱ ص ۲

اس کے بعد سند ذکر کرکے مندرجہ ذیل اثر اور حدیث نقل کی ہے۔

عن یحیی بن یعمر قال کان اول
من تکلم فی القدر یعنی بالبصرۃ
معبد الجھنی فخرجت انا و حمید بن
عبد الرحمٰن نرید مکۃ فقلنا
لو لقینا احدا من اصحاب رسول اللّٰہ
صلی اللّٰہ علیہ وسلم فسألناہ عما یقول
فلقینا عبد اللّٰہ بن عمر فاکتنفتہ
انا و صاحبی احدنا عن یمینہ و
والآخر عن شمالہ فعلمت انہ
سیکل الکلام الی۔ فقلت ابا
عبد الرحمٰن انہ قد ظھر قبلنا ناس
یتقفرون ھذا العلم ویطلبونہ
یزعمون ان لا قدر انما الامر انف
قال فاذا لقیت اولئك فاخبرھم
انی منھم بری وانھم منی برآء
والذی نفسی بیدہ لو ان لاحدھم
مثل احد ذھبا فانفقہ فی سبیل اللّٰہ
ما قبل اللّٰہ منہ شیئا حتی یؤمن
بالقدر خیرہ وشرہ ثم قال

یحیی بن یعمر سے روایت ہے کہ تقدیر کے مسئلہ
میں سب سے پہلے کلام کرنے والا شخص بصرہ کا
معبد جہنی تھا۔ میں اور حمید بن عبد الرحمٰن مکہ کے
ارادے سے (حج کے لئے) روانہ ہوئے تو ہم نے
کہا کہ کاش ہماری ملاقات کسی صحابی سے ہو جاتی
تو ہم اس سے اس چیز کے بارے میں دریافت
کرتے جو کچھ (قضا و قدر) کے متعلق یہ (معبد
وغیرہ) کہتے ہیں، حسن اتفاق سے ہماری ملاقات
حضرت عبد اللہ بن عمر سے ہو گئی، پس میں نے اور
میرے ساتھی نے ان کو اس طرح گھیرے میں لے لیا
کہ ایک انکے دائیں اور دوسرا بائیں ہو گیا،
میں نے اندازہ کیا کہ میرا ساتھی مجھی سے بات
چیت کرانا چاہتا ہے، اس لئے میں نے عرض
کیا کہ ابو عبد الرحمٰن! ہمارے یہاں کچھ ایسے
لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جو علم میں بحث کرکے کاوش
کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ تقدیر کوئی چیز ہی
نہیں ہے بلکہ (دنیا کے معاملات بغیر تقدیر کے
اپنے آپ) رونما ہو جاتے ہیں۔

حدثنا عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ
عنھما قال بینا نحن عند رسول اللّٰہ
صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذ اقبل رجل شدید
بیاض الثیاب، شدید سواد
الشعر ما یری علیہ اثر السفر ولا
یعرفہ منا احد فاقبل حتی جلس
بین یدی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
ورکبتہ تمس رکبتہ قال یا محمد
اخبرنی عن الاسلام فقال رسول اللّٰہ
صلی اللّٰہ علیہ وسلم تشھد ان لا الہ الا اللّٰہ
وان محمدا رسول اللّٰہ وتقیم الصلوۃ
وتؤتی الزکوۃ وتصوم رمضان
وتحج البیت ان استطعت الیہ
سبیلا۔ فقال صدقت فتعجبنا
من سوالہ وتصدیقہ ثم
قال: فما الایمان؟ قال
ان تؤمن باللّٰہ۔ وحدہ و
ملائکتہ وکتبہ ورسلہ و
البعث بعد الموت والجنۃ

انھوں نے فرمایا کہ جب ان لوگوں سے
تم ملو تو ان کو مطلع کر دینا کہ نہ میرا ان سے
کوئی تعلق ہے اور نہ ان کا مجھ سے کوئی واسطہ
ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں
میری جان ہے۔ اگر ان میں سے کسی کے پاس
احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو جائے اور وہ
اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالے تو اللہ
تعالےٰ اس کا یہ صدقہ اس وقت تک قبول
نہیں کرے گا جب تک کہ وہ تقدیر کے اچھے
یا برے ہونے پر ایمان نہ لائے۔ پھر انھوں
نے فرمایا کہ: ہم سے عمر بن خطاب رضی اللہ
عنہ نے بیان کیا کہ ہم لوگ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے
کہ ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت
سفید اور بال نہایت کالے تھے، اس پر
سفر کا کوئی اثر (تھکان وغیرہ) نہیں دکھائی
دیتا تھا۔ اور نہ ہم میں سے کوئی آدمی اسے
پہچانتا تھا۔ وہ آپ کے سامنے اس طرح
بیٹھا کہ اس کے اور آپ کے گھٹنے ایک

والنار وبالقدر خيره وشره
فقال صدقت ثم قال فما الاحسان
قال ان تعبد الله كانك تراه
فانك ان لم تكن تراه فانه
يراك، قال صدقت قال
فاخبرني عن الساعة فقال
ما المسئول عنها باعلم بها
من السائل قال صدقت قال
فاخبرني عن اماراتها قال
ان تلد الامة ربها وان ترى
العراة الحفاة رعاء الشاء
يتطاولون في بنيان المدر قال
صدقت ثم انطلق فلما كان
بعد ثالثة قال لي رسول الله
صلى الله عليه وسلم يا عمر هل تدري
من الرجل قال قلت الله ورسوله
اعلم قال ذاك جبريل اتاكم
يعلمكم امر دينكم وما اتاني
في صورة الا عرفته فيها

ایک دوسرے سے مس کر رہے تھے، اس نے
کہا اے محمدؐ! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے!
آپؐ نے فرمایا کہ تم اس کی شہادت دو کہ
اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمدؐ اللہ کے
رسول ہیں، اور نماز قائم کرو، اور زکات
دو اور رمضان کے روزے رکھو اور
حج کرو بشرطیکہ تم کو اس کی وسعت ہو،
اس نے کہا آپؐ نے سچ کہا ہم لوگوں کو
تعجب ہوا کہ وہ خود ہی سوال کر رہا ہے،
اور پھر اسکی تصدیق بھی کر رہا ہے، پھر اس نے
دریافت کیا ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد
فرمایا کہ تم اللہ وحدہ، اس کے ملائکہ، اس کی
کتابوں، اسکے رسولوں، اور موت کے بعد
اٹھائے جانے اور جنت ودوزخ، اور
تقدیر کے اچھے برے ہونے پر ایمان لاؤ، اس نے
کہا آپؐ نے صحیح فرمایا، پھر اس نے پوچھا
احسان کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا کہ
تم اللہ کے لیے اس طرح عمل کرو گویا تم اسے
دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ حالت نہ پیدا ہو سکے تو

الا في صورته هذه

یہ بہر حال خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیکھ رہا ہے،
اس نے کہا آپؐ نے درست کہا، پھر اس نے کہا مجھے
قیامت کے بارے میں بتائیے، آپؐ نے کہا جواب
دینے والے کو اسکے بارہ میں سائل سے زیادہ علم
و واقفیت نہیں، اس نے کہا آپؐ نے ٹھیک کہا،
مگر اسکی علامت بیان کیجیے، آپؐ نے کہا لونڈی
اپنے آقا کو جنے گی، اور تم مفلوک الحال اور بے گھر
اونٹ چرانے والوں کو دیکھو گے کہ عمارتوں میں رہنے
لگے ہیں، اس نے کہا آپؐ نے ٹھیک فرمایا، اور
چلا گیا۔ اس واقعہ کے تیسرے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے مجھ سے کہا عمر! کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ کون آدمی
تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اسکے رسول کو بہتر
معلوم ہے، آپؐ نے فرمایا یہ حضرت جبرئیلؑ تھے،
جو تمھارے پاس تم کو دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔
اور سوائے اس صورت کے وہ میرے پاس جس
صورت میں بھی آتے تھے میں ان کو ضرور پہچان
لیتا تھا۔

اس کے بعد وہ حدیث کی تصحیح و تخریج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ صحیح حدیث ہے، امام مسلم
نے اسکو عبید اللہ سے اور انھوں نے اپنے والد معاذ عنبری سے اور معاذ نے کھمس کے واسطے

روایت کیا ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ سے اس کی روایت کی تخریج میں دونوں بزرگ یعنی امام بخاری و مسلم متفق ہیں۔

پھر وہ راوی پر گفتگو مشکلات کو حل اور بعض متعلقہ مباحث کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

"عمر بن خطاب بن نفیل کی کنیت ابوحفص اور قرشی و عدوی نسبتیں ہیں، ذی الحجہ ۲۳ھ میں تریسٹھ ۶۳ سال کی عمر میں شہید ہوئے، ابن شہاب کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ دس سال تک خلیفہ رہے اور اس عرصہ میں انھوں نے ہر سال حج کیا۔"

یتقفرون العلم کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ علم کی ٹوہ اور تلاش و جستجو کر رہے ہیں۔ تقفر، تتبع اثر الشئ "یعنی کسی چیز کے نشان اور نقش کے پیچھے پیچھے ہولینے کو کہتے ہیں۔ انما الامر انف کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ نیا ہے، یعنی معاملہ تیرے اختیار میں ہے، پہلے سے کوئی قدر و مشیئت متعین نہیں ہوتی۔ "روضۃ انف" اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کسی جانور نے منہ نہ ڈالا ہو۔ اور انف الشئ چیز کے اول کو کہتے ہیں۔ فاخبرنی عن امارتها میں امارت کے معنی علامت ہیں امار اور امارۃ دونوں مستعمل ہے مگر بعض لوگوں کے نزدیک امار امارۃ کی جمع ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ظاہری اعمال کو اسلام کا اور باطنی اعتقاد کو ایمان کا نام دیا ہے مگر ایسا اس بناء پر نہیں کیا ہے کہ اعمال کا تعلق ایمان سے یا تصدیق بالقلب کا تعلق اسلام سے نہیں ہے بلکہ یہ دونوں درحقیقت اس مجموعہ کا نام ہیں جو فی نفسہ ایک ہی چیز ہے، اور دین کا لفظ ان سب کا جامع ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ [ذاک جبریل اتاکم یعلمکم امر دینکم] اور تصدیق و عمل دونوں کو ایمان و اسلام کے مجموعی الفاظ شامل ہیں، اس کی دلیل وہ آیات ہیں جو اوپر گذری ہیں۔ ان میں اللہ نے

بتایا ہے کہ اس کا پسندیدہ اور مقبول دین اسلام ہے، اور ظاہر ہے کہ دین قبولیت و رضا کے محل میں اسی وقت ہوگا جب تصدیق میں عمل بھی شامل ہو۔ ابوسلیمان خطابی فرماتے ہیں کہ مسلم بعض حالتوں میں مومن ہوتا ہے، اور بعض میں نہیں ہوتا۔ مگر مومن تمام احوال میں مسلم ہوتا ہے کیونکہ اسلام کی اصل استسلام و انقیاد ہے —— اور ایمان کی اصل تصدیق ہے، چنانچہ آدمی ظاہر میں مسلم —— ہوتا ہے مگر باطن میں وہ مطیع و منقاد نہیں ہوتا جب کہ وہ باطن کا سچا اور ظاہر کا غیر منقاد نہیں ہوسکتا، اس قضیہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر مومن مسلم ہے مگر ہر مسلم مومن نہیں، آپ کے ارشاد ما الاحسان میں احسان کے معنی اخلاص ہیں اور یہ ایمان و اسلام دونوں کی صحت کے لیے شرط ہے،

ان تلد الامۃ ربھا۔ کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کا دائرہ نہایت وسیع ہوجائے گا اور قیدیوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی، اس لئے لوگ بکثرت لونڈیاں حاصل کریں گے۔ اور ان سے اولادیں ہوں گی اس طرح آدمی کی لونڈی کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوگا وہ اپنی ماں کے لیے سید و آقا کے درجہ میں ہوگا۔ کیونکہ لونڈی اس کے باپ کی مملوکہ تھی اور باپ کی ملکیت بیٹے کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

ان تری العراۃ الحفاۃ رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان کا مفہوم امام خطابیؒ نے یہ تحریر کیا ہے کہ اس سے اونٹ پالنے اور چرانے والے خانہ بدوش عرب مراد ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ اسلام کا دائرہ جب وسیع ہوجائے گا تو یہ خانہ بدوش اور بے گھر لوگ شہروں کو فتح کر کے ان میں بود و باش اختیار کرلیں گے اور عظیم الشان محل اور عمارتیں تعمیر کریں گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا وہی مطلب ہے جو اشراط قیامت کے متعلق ایک دوسری حدیث (وینکلم فیھم الرویبضۃ) کا ہے۔ رویبضہ اس آدمی کو کہتے ہیں جو

عام لوگوں کے معاملات میں دخل دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو رابضہ یعنی بھیڑیں چرانے والا کی تصغیر بتایا ہے۔ "اور ہا" کو مبالغہ کے لیے مانا ہے۔ (شرح السنۃ ج اص ۲۲)

مصنف کے علمی و تحقیقی رنگ کا اندازہ ان مبسوط اور مفصل مباحث سے کیا جاسکتا ہے۔ جو کتاب میں جابجا ملتے ہیں۔ ذیل میں اسکی ایک مثال تحریر کی جاتی ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے کہ انزل القرآن علی سبعۃ احرف (قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے) اسکو متعدد سندوں سے نقل کرکے ان کی توثیق و تصحیح اور حوالے کی تصریح کرنے کے بعد امام بغویؒ لکھتے ہیں:۔

احرف سبعہ کے بارے میں اہلعلم مختلف الرائے ہیں، اس کی توجیہ میں ان سے متعدد اقوال منقول ہیں، بعض کے نزدیک اس سے وعدہ و وعید، حلال و حرام، مواعظ و امثال اور احتجاج، مراد ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ امر، نہی، حظر، اباحت، گذشتہ اور آئندہ کی خبریں اور امثال مراد ہیں لیکن صحیح اور ظاہر حدیث کے مطابق یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حروف سے لغات مراد ہیں، یعنی قرآن کو عرب کا ہر قبیلہ اپنی زبان میں ادغام، اظہار، امالت، تفخیم، اشمام، اتمام، ہمز، اور تلقین وغیرہ کے ان سات وجوہ کے مطابق پڑھتا ہے، جو ایک ہی لفظ کے لیے اس کی زبان میں مروج تھے۔

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ اسی طرح ہو جیسے ھلم، تعال اور اقبل ہے۔ اس کی توضیح ابن سیرین نے یوں کی ہے کہ ان کے نزدیک (ان کانت الا زقیۃ واحدۃ)، قرأت ہے جو عام قرأت میں (صیحۃ واحدۃ) ہے مگر ان دونوں کا معنی یکساں ہے۔

ابو عبید کے نزدیک اس سے اہل عرب کی سات زبانیں مراد ہیں وہ اسکو صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ اس سے ایک ہی حرف کی سات لغات مراد ہیں، ان کے خیال میں یہ ساتوں لغات قرآن کے اندر متفرق طور پر موجود ہیں پس بعض قرآن قریش کی بعض ہوازن کی بعض ہذیل کی اور بعض اہل یمن وغیرہ کی لغات کے مطابق ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن اس طرح نازل کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اجازت ہے کہ وہ اسکو ان وجوہ مختلفہ میں سے جس طور پر چاہے پڑھے کیونکہ اگر ہر ہر قبیلہ کو اس کی زبان اور طبعی عادت چھوڑنے کا مکلف بنایا جاتا تو یہ اس کے لیے نہایت دشوار ہوتا، اس کی دلیل حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ روایت بھی ہے کہ رسول کریمؐ نے حضرت جبریلؑ سے فرمایا کہ میں امیوں میں مبعوث کیا گیا ہوں، ان میں بعض بوڑھے مرد اور عورتیں ہیں بعض لڑکے اور لڑکیاں ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو سرے سے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تو حضرت جبریلؑ نے فرمایا کہ اے محمدؐ! قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف سے لغات مراد ہیں، کیونکہ اگر امر و نہی، یا وعدہ وعید مراد ہوتے تو قرأت کی بعض صورتیں دوسری صورتوں سے آسان نہ ہوتیں۔

حدیث میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن دونوں آدمیوں سے جنھوں نے دو مختلف طریقے سے قرآن کی قرأت کی تھی یہ فرمایا کہ ھکذا انزلت" یعنی اس طرح بھی قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اور اس طرح بھی۔ لیکن اگر ان دونوں قاریوں کے درمیان حلال یا حرام اور وعد یا وعید یا خبر اور واقعہ کا اختلاف ہوتا تو آپ ان دونوں کی ہرگز تصدیق نہ فرماتے، کیونکہ اس سے قرآن کے اندر اختلاف و تناقض لازم آتا۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کا کلام اس سے منزہ ہے۔ رہا دونوں قاریوں کی قرأت کا اختلاف تو وہ اللہ تعالےٰ کے اس قول میں داخل نہیں ہے۔

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (نساء ۸۲)

اگر (قرآن) خدا کے بجائے اور کسی کا کلام ہوتا تو یہ لوگ اس میں متعدد اختلافات پاتے۔

کیونکہ ان حروف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بغیر توقیف کے جو شخص جس طرح بھی چاہے اپنی لغت کے مطابق قرآت کرے بلکہ یہ حروف منصوص اور اللہ کا وہی کلام ہیں جنکو لے کر حضرت جبریلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترے، اس کا ثبوت خود زیر بحث روایت ہے کہ

اِنَّ ھٰذَا القرآنَ اُنْزِلَ عَلٰی سبعۃ احرف

یہ قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔

اس میں تمام حروف کو منزل بتایا گیا ہے اور جس قدر قرآن مجید نازل ہو چکا ہوتا تھا اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان کے مہینہ میں حضرت جبریلؑ سے دور کرتے تھے۔ سو اللہ تعالےٰ اس میں سے جس کو چاہتا تھا باقی رکھتا تھا۔ اور جس کو چاہتا تھا منسوخ کر دیتا تھا۔ آپ ہر دورہ میں ان صورتوں میں سے جن کو خدا نے مباح قرار دیا تھا کسی ایک صورت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے، حالانکہ آپ کو اجازت تھی کہ ان تمام وجوہ کے مطابق قرآن کو پڑھیں اور پڑھائیں، جن کے معانی یکساں تھے گو ان کے حروف میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ عبدالرحمٰن نے اپنے والد ابو بکرہؓ سے روایت کی ہے کہ جب حضرت جبریلؑ نے رسول اللہؐ سے کہا کہ اقرا القرآن علی حرف (قرآن کو ایک حرف پر پڑھیے)، تو حضرت میکائیلؑ نے کہا کہ استزدہ (ابھی اس میں اور اضافہ کرو) تو حضرت جبریلؑ نے آپ سے دو حرفوں پر پڑھنے کے لیے کہا۔ اس طرح سات حرفوں پر پڑھنے کیلئے کہا اور فرمایا

کلھا شاف کاف کقولک ھلم وتعال مالم یختم آیۃ رحمۃ بآیۃ عذاب وآیۃ عذاب بآیۃ رحمۃ

یہ سب وجوہ کافی اور تمہارے قول ہلم وتعال کی طرح ہیں جب تک کہ رحمت کی کسی آیت کو عذاب کی کسی آیت پر اور عذاب والی کو رحمت والی آیت پر ختم نہ کیا جائے

بعینہ اسی طرح کی روایت ابی بن کعبؓ سے بھی مروی ہے ملاحظہ ہو۔

لیس منھا الا شاف کاف ان قلت سمیعا علیما عزیزا حکیما مالم تختم آیۃ عذاب برحمۃ او آیۃ رحمۃ بعذاب

یہ سب (ساتوں وجہیں) کافی ہیں اگر تم سمیعا علیما کہو یا عزیزا حکیما تو درست ہوگا تاآنکہ عذاب کی آیت کو رحمت کی آیت پر اور رحمت کی آیت کو عذاب کی آیت پر نہ ختم کرو۔

یہ معاملہ آپ کی مبارک زندگی میں اور آپ کے بعد بھی اسی طرح رہا چنانچہ لوگ ان قراتوں کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے تھے جن کی آپ نے خدا کے حکم سے تلقین فرمائی تھی، مگر حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب قاریوں کے درمیان اختلاف رونما ہوا اور معاملہ نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ ایک قاری دوسرے کو برا بھلا کہنے لگا اور لوگوں کو افتراق و انتشار کا خطرہ نظر آنے لگا تو حضرت عثمانؓ نے تمام صحابہ کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ لیا اور سب کے اتفاق سے ایک ایسے مصحف کو تجویز و اختیار کیا گیا جس کا رسول اللہؐ نے حضرت جبریلؑ سے آخری بار دور کیا تھا، اور جس کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ کے مشورہ سے جمع کیا تھا، کیونکہ ان کے زمانہ تک قرآن مختلف ٹکڑوں میں منتشر تھا لیکن جنگ یمامہ میں جب متعدد حفاظ قرآن شہید ہوئے اور صحابہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں قرآن

ضایع نہ ہوجائے تو حضرت ابوبکرؓ نے کاتبوں کو ایک مصحف کے اندر مکمل قرآن کو جمع کر دینے کا حکم دیا تاکہ لوگ اس پر اعتماد کریں۔ اور اسی کی جانب رجوع کریں، حضرت عثمانؓ نے اسی کو نقل کرنے اور بقیہ نسخوں کو جلا ڈالنے کا حکم دیا تاکہ اختلاف کی بنیاد ہی مسمار ہوجائے اسطرح جو اس متفق علیہ خط سے مختلف تھا۔ وہ منسوخ کے حکم میں ہوگیا۔ جس طرح اور باتیں بھی صحابہؓ کے اتفاق اور اجماع سے منسوخ قرار پاچکی ہیں۔

اس تحریر سے ظاہر ہوگیا کہ لوحین کے درمیان مکتوب ہی کو اللہ عزوجل کی جانب سے بندوں کے لئے محفوظ کیا گیا ہے۔ اور یہی امت مرحومہ کا امام و رہنما بھی ہے اس بناء پر اس کے الفاظ میں کسی طرح کا تجاوز اور اسکی کتابت و تحریر کی مخالفت جائز نہیں، ہاں مختلف لغات میں وہ قرأت روا ہے جس کا خط اور تحریر اس کے موافق ہو، اس قدر گنجائش اور وسعت کو اب بھی باقی کہا جاسکتا ہے، بشرطیکہ آنحضورؐ سے عادل رواۃ کی نقل کے مطابق اس کی صحت و ثبوت مسلم ہو جیسا کہ مشہور قراء کی معروف قرائتیں بطریقہ صحت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے، منقول ہیں۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی اثر (القرآن سنۃ متبعۃ) کا مفہوم یہ ہے۔ کہ حروف و قرأت میں متقدمین کا اتباع ایسی سنت متبعہ ہے جس میں مصحف اور مشہور قرأت کی مخالفت جائز نہیں اگرچہ از روئے لغت وہ صحیح اور جائز ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ صحابہ و تابعین کا اجماع ہے کہ قرأت سنت ہے، اس لیے کسی حرف کی وہی قرأت درست ہوگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقراء اور مصحف کے مطابق ہو۔

"کلھا شاف کاف" کا مفہوم یہ ہے کہ ان حروف سبعہ میں سے ہر حرف مومنین کے سینوں کے لیے شافی ہے کیونکہ ان کے معانی ایک ہیں اور وہ سب وحی و تنزیل ہیں، جیسا کہ فرمایا۔

قل ھو الذین اٰمنوا ھدی وشفاء (فصلت ۴۴)	تم کہو کہ وہ (قرآن) ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور موجب شفاء ہے

اور کافی اس حیثیت سے ہے کہ وہ رسول اللہ کی سچائی پر اپنے نظم کے اعجاز اور دوسروں کے اس جیسا کلام لانے میں بے بس ہونے کی بناء پر حجت ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالےٰ اعلم۔
(باقی)

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا اور ہزاروں محققانہ علمی و ادبی تاریخی و فقہی و دینی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے جو ۸۰ سال سے اپنی شاندار روایات کے ساتھ یکساں جاری ہے، اس کے مضمون نگاروں میں تلامذۂ شبلی کے علاوہ ملک کے بلند پایہ اصحاب قلم و ارباب علم و دانش ہیں، جن کے تحقیقی مضامین و ادبی نگارشات سے اس کے صفحات مزین ہیں، کیفیت وکمیت دونوں لحاظ سے مشکل ہی سے اردو کا کوئی رسالہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی ہے، یورپ کے ہر ملک کے مستشرقین نے اس کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات اور مستشرقانہ معلومات کی داد دی ہے، اس رسالہ کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے کتبہ میں محفوظ ہے، بعض بعض سالوں کی مرتب جلدیں بھی ہیں، اور ہر سال کے متفرق پرچے تو بہت زیادہ ہیں، جن صاحب کو اس بیش بہا علمی ذخیرہ کی ضرورت ہو، دفتر سے خط وکتابت کریں۔ کوئی کتب خانہ خواہ وہ پرائیویٹ ہو، یا پبلک اس متاع علمی سے خالی نہ ہونا چاہئے۔

(منیجر)

قبل اسلام کی عربی شاعری پر دینِ حنیفی کے اثرات

مترجمہ
محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے (علیگ)

ادب میں زندگی کی جتنی بھرپور عکاسی زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری میں ملتی ہے، اس کی مثال غالباً دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب میں نہیں مل سکتی، اسی باعث عربی شاعری کو عربوں کا دفتر کہا گیا ہے کہ اس کے آئینہ میں عربوں کے اخلاق و عادات تہذیب و تمدن اور معاشی و معاشرتی کوائف کی ہو بہو تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے، اسی لیے محققین نے جاہلی شاعری کی بنیاد پر اس عہد کے مختلف پہلوؤں پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مخدوم گرامی جناب ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ صاحب (ریڈر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی) کی انگریزی کتاب "قبل اسلام کی عربی شاعری میں مذہبی رجحانات" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مسلم یونیورسٹی نے موصوف کو اس گرانقدر تحقیقی کام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بلاشبہ بڑی عرق ریزی، دیدہ وری اور کاوش کے ساتھ جاہلی شعراء کے مذہبی رجحانات کو اجاگر کیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض بڑے اہم اور فکر انگیز نکات پیش کیے ہیں۔ ذیل میں اس قابل قدر کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ناظرین معارف کی ضیافت طبع

کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں جاہلی شاعری پر دین حنیفی کے اثرات و میلانات سے بحث کی گئی ہے۔

"نعیم"

تمہید | قبل اسلام کی عربی شاعری کا دستیاب حصہ بلاشبہہ نہایت قیمتی اور اہم ہے اس میں زمانہ جاہلیت کے عربوں، ان کے عادات و اطوار اور انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مکمل تفصیل ملتی ہے۔ اسی باعث "الشعر دیوان العرب" کا مقولہ بہت مشہور رہا۔ یعنی عربی شاعری عربوں کا عوامی رجسٹر ہے۔ اس لیے یہ بالکل فطری و بدیہی امر ہے۔ کہ اس عہد کی شاعری میں عربوں کے مذہبی جذبات کی ترجمانی بھی موجود ہوگی۔ اور جیسا کہ پیش نظر جائزہ سے ظاہر ہے۔ اس شاعری میں مذہبی رنگ کافی نمایاں ہے۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ زیر بحث مضمون میں محض ان ہی عقائد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن کے اثرات اس دور کی شاعری میں کافی نمایاں طور پر موجود ہیں۔ اور جن عقائد مثلاً صابیہ، مجوسیہ اور زندقہ کا نمایاں ذکر اس عہد کی عربی شاعری میں نہیں ملتا۔ ان کو میں نے عمداً اس جائزہ میں شامل نہیں کیا ہے۔ حالانکہ دوسرے ذرائع سے ان کے وجود کا بھی ثبوت مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بت پرستی کو لے لیجے جو قبل اسلام عربوں میں بہت عام تھی۔ لیکن بت پرستانہ افکار و خیالات کی جھلک ان کی شاعری میں بہت شاذ و نادر ہی ملتی ہے، اس بارے میں محققین نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ مسلمان راویوں نے جان بوجھ کر ان نظموں کو نظر انداز کر دیا جن میں بت پرستی کا تذکرہ تھا[1]۔ چونکہ اسلام کے نزدیک بت پرستی ایک قبیح و بد ترین فعل شمار ہوتی تھی۔ اس لیے مسلم راوی اس کا ذکر بھی پسند

---

[1] الحیاۃ العربیہ عوفی ص ۹۰، ۴۹ و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان جلد ۱ ص ۶۱

نہیں کرتے تھے۔ اور ان کو اس خیال ہی سے شرم آتی تھی کہ ان کے اسلاف بت پرستی
کا شکار رہے۔ لیکن راقم سطور کے خیال میں یہ اسکی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی،
کیونکہ اگر اس میں کوئی حقیقت ہوتی تو بت پرستی کے بارے میں کوئی بھی شعر ہم تک نہ پہونچ
سکا ہوتا۔ حالانکہ ہمارے پاس قبل اسلام کی عربی شاعری کا جو بھی ذخیرہ ہے اسمیں
اصنام پرستی کا واضح تذکرہ موجود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مسلمان راویوں کے ذریعہ
ہی ہم تک پہونچا ہے۔ ان رواۃ شعر نے ایسے اشعار کو بھی محفوظ رکھا ہے جن میں
رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صحابہ کرام کا ان کے مخالفین نے مذاق اڑایا
یا اسلامی اصولوں کا تمسخر کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ رواۃ اپنے اسلاف کے قیمتی ورثہ
کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔

بہرحال اگر ہم اس نظریے کو تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیں تو عہد جاہلیت کے
مذہبی ارکان جو بعد میں خود اسلام کے بھی ارکان بن گئے۔ مثلاً زیارت کعبہ کے بارے میں
اشعار کا وسیع ذخیرہ دستیاب ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر ایسے اشعار تھے تو ان کو مسلمانوں نے
یقیناً نظر انداز نہ کیا ہوگا۔ لیکن درحقیقت ایسی نظمیں بھی ہم کو شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک دوسرا نظریہ یہ ہو کہ قبل اسلام کے عرب مذہب سے زیادہ
شغف نہیں رکھتے تھے۔[1] یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر
جاہلی شاعری سے کوئی شخص یہ پتہ لگانا چاہے کہ کفار عرب اپنے بتوں کے سامنے کس طرح
سجدہ ریز ہوتے اور عبادت کے وقت کس طرح انکی حمد و ثنا پڑھتے تھے۔ تو اس کو
یقینی طور پر مایوسی ہوگی۔ کیونکہ جہانتک میرے علم کا تعلق ہے ایسی کوئی بات زمانہ

[1] عربوں کی ادبی تاریخ (انگریزی) نکلسن ص ۱۳۵، تاریخ الادب العربی حنا الفاخوری ص ۱۴

جاہلیت کے عربوں میں موجود نہیں تھی۔ ان کی بت پرستی صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی۔
ایک اپنے بتوں کا طواف، دوسرے ان کے لیے قربانیاں کرنا اور ان باتوں کا حوالہ
قبل اسلام کی عربی شاعری میں واضح طور پر موجود ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان
موضوعات پر مکمل نظمیں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ طویل نظموں کے درمیان اس بارے
میں متفرق و منتشر اشعار ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قبل اسلام کی شاعری ایک
خاص قسم کے انداز و نہج پر مشتمل تھی۔ اور ہر شاعر حصول شہرت کی خاطر اسی طرز کو
اپناتا تھا۔ ان اشعار میں عام طور پر یا تو جنگجویانہ انداز کی ڈینگیں ہوتیں یا شاعر مختلف
قبائل و افراد کی شجاعت کے کارناموں کا تذکرہ کرتا تھا۔ یا پھر چٹیل میدانوں میں
سفر کی صعوبتیں، خون کا بدلہ لینے کی خواہش کا اظہار، خطرات کے مقابلہ میں شجاعت
و قوت تحمل کا مظاہرہ یا مہمان نوازی کی تعریف ہوتی تھی۔ اس عہد میں صرف ایسی ہی
نظموں کو قبول عام حاصل تھا۔ لہذا راوی ان نظموں کو یا تو مجمع عام میں یا مخصوص
شعری نشستوں میں پڑھتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی کسی خاص جذبہ کے تحت
مکمل مذہبی نظمیں بھی کہی گئی ہوں۔ لیکن وہ دیرپا ثابت نہ ہوتی تھیں۔

ایک دوسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ اسلام کی طرح خدائے واحد کی عبادت کا
ذکر جاہلی شاعری میں کافی بڑی حد تک موجود ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بت پرستی
کے بارے میں بھی بکثرت اشعار ملتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک ہی جاہلی
شاعر کے یہاں کسی وقت تو خدائے وحدہ کی پرستش کو نمایاں طور پر ذکر کیا
گیا ہے۔ اور کبھی بت پرستی کے جذبات ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہ بھی خوب اجتماع
ضدین ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی افکار کا حامل اس دور کے بعض اشعار کو

مسلم رواۃ کے منحول اشعار بتایا جاتا ہے[1] اس امکان سے انکار نہیں کہ کچھ راویوں نے ایسا من گھڑت کام کیا ہو۔ لیکن اس کی وجہ سے جاہلی شاعری کے تمام ذخیرہ کو جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں بغیر کسی معقول دلیل اور واضح ثبوت کے ان نظموں کی اصلیت سے انکار مناسب نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی عقائد سے مماثل بہت سے مذہبی عقائد و ارکان زمانہ جاہلیت کے عرب میں موجود تھے۔ اسلام نے ان چیزوں کو یا تو بعینہ یا بہت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ قبل اسلام کی عربی شاعری میں اسی طرح مذہبی حوالے بھی بکثرت ملتے ہیں، بعض مستشرقین ان اشعار کی اصلیت یہ کہکر تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ان پر عیسائیت اور یہودیت کے اثرات پڑے ہیں۔[2] لیکن میرے خیال میں یہ اشعار دین ابراہیمی کے تاثر کا نتیجہ ہیں،

اگر ہم زمانہ ما قبل اسلام کے عرب کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اور واضح ہو کر سامنے آئے گی۔ رینان کا یہ خیال کہ قدیم عرب دوسری سامی قوموں کی طرح فطرۃً توحید پرست تھے، غلط معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کے علاوہ متعدد محققین نے بھی ثابت کیا ہے۔[3] لیکن یہ درست ہے کہ حجاز کے عرب باشندے حضرت ابراہیمؑ کی آمد اور حضرت اسماعیلؑ کے قیام مکہ کے بعد توحید سے بخوبی روشناس ہو گئے تھے۔ کیونکہ سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ علیہما السلام خود توحید کے علمبردار

---

[1] Mohammad and The Rise of Islam by D.S Margoliouth. P 60

[2] Ancient Arabian Poetry by C.J. Lyall P. 92

[3] تاریخ العرب جواد علی ج ۱۲ ص ۲۵۴

علمبردار تھے۔ انھوں نے کعبہ کی تعمیر کی اور خلق کو خدائے وحدہ کی پرستش کی دعوت دی یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جنوبی عرب کے مہاجرین عربوں کو چھوڑ کر باقی تمام عرب جنھیں عروج حاصل ہوا۔ اور جو شمال کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ سب حضرت اسماعیلؑ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[1]

اس لیے مسلمان مؤرخین اور رواۃ کا یہ عام نظریہ ہے کہ حجاز کے عوام عرصہ دراز سے دین ابراہیمی کی پیروی کر رہے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ چونکہ ان لوگوں کا اختلاط دیگر مذاہب کے متبعین سے ہوتا رہا اس لیے ان کے دین میں ابتدائی پاکیزگی باقی نہ رہ گئی۔ اور کافی حد تک مشرکانہ خیالات و افعال ان کے مذہب کا جزو بن گئے۔[2] لیکن دین ابراہیمی کے عقائد سے دور ہو جانے کے باوجود وہ کچھ امور میں اب بھی ان کے عقائد کافی حد تک اتباع کرتے رہے۔ مثلاً خدا کی وحدانیت، زیارت مکہ اور خانہ کعبہ کے پاس قربانی کرنا وغیرہ،[3]

اس طرح عہد ما قبل اسلام کے عرب نہ تو صحیح معنوں میں مکمل توحید پرست تھے نہ خالص اصنام پرست، بلکہ علاوہ ایک ایسے مخلوط مذہب کے متبع تھے جس میں مقامی اور بیرونی مذاہب کے ملے جلے عقائد و ارکان شامل تھے۔ چنانچہ ان میں اگر ایک طرف بت پرستی رائج تھی تو دوسری طرف ان کے دلوں میں ایک عظیم خدا کی وحدانیت کا عقیدہ بھی موجود تھا۔ ان کی اصنام پرستی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خدا کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ اور نہ وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو خدا کے درجہ کے برابر ہی سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان کے دیوی دیوتا اللہ تعالےٰ اور اس کی مرضی کے تابع و تحت ہیں۔

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۵۴ [2] کتاب الاصنام لابن الکلبی ص ۶-۸ [3] ایضاً

بایں ہمہ مجموعی حیثیت سے عرب مشرکانہ عقائد کے حامل تھے، اور ان کا شرک اس نظریہ پر مبنی تھا کہ مادی اور روحانی طاقتوں میں کافی حد تک مماثلت موجود ہے۔ درحقیقت ان کا خیال تھا کہ جس طرح کوئی بادشاہ اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں پر اپنے وفاشعار ملازموں کو حاکم بنا کر بھیجتا ہے۔ اور ان کو اپنے علاقہ عوام کے چھوٹے موٹے مسائل کو طے کرنے کا اختیار بھی دیتا ہے۔ نیز وقتاً فوقتاً ان سے مشورے بھی کرتا ہے، اور رعایا کے بارے میں ان کی بعض سفارشات کو شرف قبول بھی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ جل شانہ نے بھی نظام عالم کو چلانے کی کچھ ذمہ داری اپنے ان وفادار ماتحتوں کو دے رکھی ہے۔ جنھوں نے اپنی ریاضت، طہارت اور عبادت کے ذریعہ اعلیٰ روحانی مدارج طے کیے ہوں۔ اس لئے وہ خدا کو خوش کرنے کے لیے اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اور اس غرض کے لیے وہ قربانیاں کرتے، ان کی قسمیں کھاتے اور نذریں چڑھاتے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان دیوتاؤں کے مجسمے بھی بنا لیے، اور ان مجسموں کو وہ اپنے دیوتاؤں کی روح کا ماوٰی سمجھتے تھے۔ مورتیاں بنانے اور ان کی پوجا کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ اتنا عام ہو گیا کہ کوئی بھی چیز جس میں کسی روح کے موجود ہونے کا گمان ہوتا تھا، ان لوگوں کی تعظیم و عبادت کا مرکز بن جاتی تھی، اور اس سلسلہ میں جس طرح کی بھی مذہبی تقریبات انھیں پسند آتیں ان کا انعقاد کرتے تھے۔[1]

اپنے بتوں کے بارے میں ان کے نظریات مختلف تھے۔ ممکن ہے کچھ جاہل بدّو ان کو اصل خدا ہی سمجھتے رہے ہوں۔ لیکن کفار عرب کی اکثریت ان کو محض ایک عظیم

---

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الفوز الکبیر ص ۶-۴

طاقت کی علامت خیال کرتی تھی۔ کچھ کا خیال تھا کہ ان کے بت خدا اور بندے کے درمیان ایک وسیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (کیونکہ ان کے نزدیک خدا تک براہ راست رسائی ناممکن تھی) ایک فرقہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل تھا جو اس عقیدہ کے حامل تھے کہ خدا نے بتوں کے لیے کچھ ارواح کو مخصوص کر رکھا ہے۔ اور ان بتوں کو اللہ نے کچھ ایسی طاقتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ جن کے باعث وہ کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔[1]

مندرجۂ بالا بحث سے بہت صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اگرچہ کفار عرب لاتعداد بتوں کی پرستش کرتے تھے، تاہم خدائے برتر و عظیم کی وحدانیت کا عقیدہ ان کے دلوں میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھا، اس بارے میں بکثرت آیات قرآنی سے استشہاد کیا جا سکتا ہے۔ اور بلاشبہ قرآن کریم کی شہادت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔

قُلْ مَنْ یَرْزُقُکُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝	[illegible]	(ان لوگوں سے) کہیے کہ تم کو آسمان و زمین سے کون روزی دیتا ہے یا تمھارے کان اور آنکھیں کس کے قبضہ میں ہیں اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ اور کون (دنیا کا) انتظام چلا رہا ہے۔ تو وہ بے تامل بول اٹھیں گے کہ اللہ۔ تو ...

---

[1] بلوغ الارب ج ۲ ص ۹۸-۱۹۷

قل لمن الأرض ومن فيها
ان كنتم تعلمون . سيقولون
لله . قل افلا تذكرون .
قل من رب السموات
السبع ورب العرش العظيم
سيقولون الله قل افلا
تتقون . قل من بيده
ملكوت كل شئ وهو يجير
ولا يجار عليه ان كنتم
تعلمون سيقولون الله
قل فانى تسحرون

(ان لوگوں سے) کہیئے کہ اگر تم کو علم
ہو تو بتاؤ کہ جو کچھ زمین اور اس میں ہے
وہ کس کا ہے؟ وہ فوراً جواب دیں گے کہ
اللہ کا۔ ان سے کہئے کہ پھر تم کیوں غور
نہیں کرتے۔ ان سے پوچھیے کہ سات آسمانوں
.... اور عرش عظیم کا مالک
کون ہے تو فوراً جواب دیں گے کہ اللہ
ہی کا ہے؟ اب آپ (اے پیغمبر) ان سے
کہئے کہ کیا پھر تم کو اس سے ڈر نہیں لگتا ہے؟
آپ ان سے کہئے اگر تم کو معلوم ہے تو
بتاؤ کہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز
کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے۔
اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ
نہیں دے سکتا۔ وہ فوراً بول اٹھیں گے
کہ وہ اللہ کی ذات ہے! آپ کہدیجئے کہ
پھر تم کیسے سحرزدہ ہو جاتے ہو۔

ويعبدون من دون الله
ما لا يضرهم ولا ينفعهم و
يقولون هؤلاء شفعاؤنا

اور (مشرکین) خدا کے سوا ایسی چیزوں
کی پرستش کرتے ہیں جو نہ تو ان کو
نقصان ہی پہنچا سکتی ہیں اور نہ

عند الله

فائدہ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے معبود
اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

والذين اتخذوا من دونه
اولياء ما نعبدهم الا
ليقربونا الى الله زلفى

اور جن لوگوں نے خدا کے سوا حمایتی
بنا رکھے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو
ان کی پرستش صرف اسلئے کرتے ہیں کہ
خدا سے ہم کو نزدیک کریں۔

یہاں غالباً یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ قرآن کریم کا خطاب ایک ہی مذہب کے متبعین کے کسی خاص طبقہ یا فرقہ سے نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ کچھ یوروپین محققین غلطی سے سمجھتے ہیں، اور اسی سوء تفاہم کے باعث وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں متضاد بیانات ملتے ہیں۔[۱] حالانکہ قرآن نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو مختلف آیات کے ذریعہ خطاب کیا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب میں کچھ لوگ ایسے تھے جو خدا کے وجود کے منکر تھے۔ اور کچھ لوگ اس کے وجود پر تو ایمان رکھتے تھے مگر عقیدہ بعث بعد الموت کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح ایک فرقہ ایسا بھی تھا جو خدا کے وجود اور حیات بعد الممات دونوں کا قائل تھا لیکن وہ انبیاء کی بعثت اور ان کے جسمانی شکل میں ظاہر ہونے کو نہیں مانتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں پر مشتمل ایک اور گروہ بھی تھا جو نہ صرف خدا پر ایمان رکھتا تھا۔ بلکہ حیات بعد الموت اور رسالت کا بھی قائل تھا، اسی آخر الذکر طبقہ کو عام طور سے ملت حنیفی کہا جاتا ہے۔[۲]

---

[۱] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۲ ص ۵۸۵ [۲] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۵۸۵، ۵۸۶۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہوجاتا ہے کہ جاہلی عربوں میں شرک وبت پرستی کا فعل اور توحید کے عقائد دوش بدوش پائے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک خدا زمین وآسمان کا خالق، کائنات کا چلانے والا، موت وحیات عطا کرنے والا، نعمتیں بخشنے والا، کائنات کی شیرازہ بندی کرنے والا اور عالم الغیب تھا۔ لیکن یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عہد جاہلیت کے عرب یہی سب عقائد رکھتے تھے تو پھر انھوں نے حضور اکرمؐ کی اتنی شدید مخالفت کیوں کی؟ ان کے مشن میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ اور آخر میں ان کے ساتھ لڑنے مرنے تک کو تیار ہوگئے۔ بلاشبہہ اہل مکہ کی یہ مخالفت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محض تعلیمات کا ردعمل نہ تھی۔ بلکہ ان کے مشن کے مختلف مراحل سے پیدا ہونے والا ردعمل تھا۔ حضورؐ نے عربوں کو صرف توحید کی دعوت دینے ہی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ انھوں نے لوگوں کو ہر قسم کی بت پرستی اور مشرکانہ افعال سے دور رہنے کی بھی تلقین کی۔ سرور کائناتؐ نے ان بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی یہ کہکر مذمت کی کہ یہ تو خود انسانوں کی تخلیق ہیں۔ لہذا ان کو انسانوں پر کوئی قدرت وفوقیت حاصل نہیں ہے۔ اہل مکہ نے جو نہایت متمرد وسرکش تھے، اس چیز کو اپنی تذلیل محسوس کیا۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتے تھے۔ مگر ذلت نہیں۔ کیونکہ یہ چیز انکی فطرت وجبلت کے خلاف تھی۔ اسی لیے وہ حضور اکرمؐ کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے۔ شروع شروع میں تو ان کی مخالفت محض اپنے دین واخلاق کی دیرینہ روایات کو قائم رکھنے کے لیے زبان کی حد تک محدود رہی۔ لیکن جب حضورؐ نے یہ فرمایا کہ ان کے اسلاف خود ہی صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہ ہوگئے تھے، تو یہ لوگ شدید برہم ہوگئے۔ اور ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اسلیے کہ

جاہلی عربوں کو اپنے اسلاف پر بے حد فخر ونازتھا۔ اور وہ اپنی قدیم روایات کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جیسا کہ ان کی شاعری سے ثابت ہوتا ہے۔ غرض حضور سے ان کی مخالفت وعداوت رفتہ رفتہ بڑھتی ہی رہی، اور بالآخر وہ نہایت سنگین مراحل تک پہونچ گئی۔

مذہب کے علاوہ سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی محرکات بھی اس سلسلہ مین کار فرما تھے۔ اہل مکہ کی خانہ کعبہ کے محافظ کی حیثیت سے پورے ملک میں بڑی عزت تھی۔ اور یہ لوگ اپنے نفع بخش تجارتی پیشوں کے باعث بہت دولت مند بھی تھے اسکے برخلاف حضور اکرمؐ اہل ثروت نہ تھے لہذا مشرکین مکہ ایک غریب آدمی کی باتوں کی اتباع اپنے لیے باعث ننگ خیال کرتے تھے۔ اور اس کی مذہبی قیادت کو تسلیم کرنے میں انھیں اپنی ذلت محسوس ہوتی تھی۔ قرآن کریم میں ان کے اعتراضات کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

وقالوا لولا نزل ھذا	اور انھوں نے کہا کہ یہ قرآن دو بستیوں
القرآن علی رجل من	(مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی
القریتین عظیم۔	پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔

مزید برآن ان کا قبائلی یا جاگیردارانہ سماجی ڈھانچہ کچھ اس قسم کا تھا کہ خون اور نسل کی بنیاد پر سماج میں کچھ لوگوں کو دوسروں پر فوقیت حاصل رہتی تھی لیکن سرور دو عالمؐ اس تفریق کے قائل نہ تھے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے معاشرہ کو تشکیل دینا چاہتے تھے۔ جس کی بنیاد اخوت ومساوات کے اصولوں پر ہو، اور جس میں امیر وغریب یا

کالے اور گورے کی تفریق کا شائبہ بھی نہ ہو۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے ان کے اخلاقی کردار کی بھی مذمت کی۔ مثلاً یہ کہ وہ بدلہ لینا نہایت ضروری قرار دیتے تھے جبکہ حضورؐ کی تعلیمات اس کے بالکل خلاف تھیں۔ آپؐ نے عفو و درگذر کی تعلیم دی اسطرح وہ اس کو بھی ضروری خیال کرتے تھے کہ قبیلہ کے ہر فرد کو اپنے قبیلہ کے ہر معاملہ میں ساتھ دینا چاہیے، جب کہ حضورؐ نے انھیں یہ ہدایت کی کہ محض حق و انصاف کا ساتھ دو۔ اسی طرح انھیں اپنے اسلاف کے کارناموں پر نہایت فخر تھا۔ جب کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے انھیں روایات پرستی سے باز رہنے اور خود اپنے اندر اوصاف حمیدہ پیدا کرنے کی تلقین کی۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف وحدانیت کی دعوت ہی نہیں بلکہ مذکورۃ الصدر تمام ہی حقائق و محرکات ان اسباب کے ذمہ دار تھے، جن کے باعث مشرکین مکہ حضور اکرمؐ کی کھلم کھلا مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ خاموش رہے تو ان کی دولت مندانہ فوقیت ختم ہو جائے گی۔ اور ان کے دیرینہ سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی رسوم و رواج سب درہم برہم ہو جائیں گے، اسی لئے وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ جائز یا ناجائز کسی بھی طریقہ سے اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر حضور اکرمؐ نے اپنے کو صرف زبانی تعلیمات تک ہی محدود رکھا ہوتا اور اپنے متبعین سے محض نمائشی اتباع کا مطالبہ کیا ہوتا۔ نیز انھوں نے مشرکین مکہ کی روزمرہ کی زندگی میں دخل اندازی نہ کی ہوتی تو مکہ میں کوئی کشمکش پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پھر کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد نہ ہوا ہوتا۔

حنیفیت

عرب کے حنیفی۔ ظہور اسلام سے قبل عرب میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کو بت پرستی اور شرک سے بے انتہا نفرت تھی۔ اور وہ اپنے دور میں مروج مشرکانہ تقریبات میں کبھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو صاف صاف ان باتوں کی مذمت بھی کرتے تھے بعض روایات کے مطابق عہد جاہلیت میں بہت سے مذہبی مفکرین اور فلاسفہ ایسے بھی تھے جو ان مشرکانہ افعال سے اجتناب کرتے تھے جو عمرو بن لوئی نے مذہب میں شامل کر رکھے تھے۔ (یہی وہ شخص ہے جو عرب میں رسم بت پرستی کا بانی خیال کیا جاتا ہے) اس کا برخلاف وہ لوگ دین ابراہیمی پر شدت سے قائم تھے۔[1] یہ لوگ نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی۔ بلکہ وہ حنیفی کہے جاتے تھے۔ کیونکہ حنیف سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کی عرفیت تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا سچا پیرو کہتے تھے۔ جس کی بنیاد وحدانیت پر قائم تھی۔

اسلام سے پہلے لفظ حنیف میں کوئی مذہبی تصور شامل نہیں تھا۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ جیران العود کہتا ہے۔

وادرکن أعجازاً من اللیل بعد ما   اقام الصلوۃ العابد المتحنف[2]

ابوذؤیب الہذلی کا درج ذیل شعر بھی اسکا شاہد ہے۔

اقامت بہ کمقام الحنیف   شہری جمادی وشہری صفر[3]

اس سلسلہ میں امیہ بن ابی الصلت کا یہ شعر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱؎ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ الیعقوبی ج ۱ ص ۲۹۱، بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۴۴
۲؎ تاریخ العرب جواد علی ج ۵ ص ۵۶ ۳؎ لسان العرب ج ۹ ص ۵۰ ۴؎ ایضاً

کل دین یوم القیامة عند الله إلا دین الحنیفة زور[۱]

(دین حنیفی کے علاوہ تمام دین قیامت کے دن خدا کے نزدیک جھوٹے ہوں گے)

علاوہ ازیں لفظ حنیف قرآن کریم میں متعدد جگہ استعمال کیا گیا ہے اور تقریباً ہر جگہ یہ مشرک کی ضد کے طور پر آیا ہے۔ یہاں چند آیات قرآنی درج کیجاتی ہیں۔

(۱) فاتبعوا ملة ابراهیم حنیفاً وما کان من المشرکین — پس ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو ایک خدا کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

(۲) ولکن کان حنیفاً مسلماً وما کان من المشرکین — بلکہ وہ ایک بندہ فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

(۳) وان اقم وجهك للدین حنیفاً ولا تکونن من المشرکین — اور یہ کہ اپنا دین کی طرف اپنا منہ سیدھا کیے چلا جا اور مشرکوں کو زمرے میں ہرگز شامل نہ ہو

(۴) حنفاء لله غیر مشرکین به — .... بس ایک اللہ کے ہو رہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

مذکورۂ بالا حقائق اس بات کو شک وشبہ سے بالاتر قرار دیتے ہیں کہ لفظ حنیف اسلام سے پہلے بھی مستعمل تھا۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ جو کردار کی پاکیزگی کے قائل، بت پرستی اور شرک کے مخالف اور توحید کی طرف مائل تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حنیفی یہود و نصاریٰ کی طرح کوئی منظم فرقہ نہیں تھے۔ بلکہ اس طرح کے عقائد وخیالات رکھنے والے افراد ہر قبیلہ میں پائے جاتے تھے۔

اگرچہ حنیفیوں میں سے کچھ نے آخر میں عیسائیت کو اپنا لیا تھا لیکن وہ دراصل حقیقی حنیفیت یعنی دین ابراہیمی کے متلاشی تھے۔ اور اس کی جستجو میں انھوں نے دور دراز

[۱] لسان العرب ج ۹ ص ۵۸

ممالک کا سفر بھی کیا۔

حنیفی شاعری

غالباً کچھ حنیفیوں میں شاعرانہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی ان سے منسوب اشعار کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ ان اشعار میں مکمل طور پر تو نہیں مگر کافی حد تک ان کے مذہبی خیالات کی جھلک ملتی ہے۔ اور اس لحاظ سے ہم اسے مذہبی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اس شاعری کا تفصیلی جائزہ ضروری ہے۔ لیکن اس سے قبل ہم کو ان نظموں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جو اگرچہ مشرک شعراء کی طرف منسوب ہیں مگر بت پرستی اور شرک کی مخالفت اور حنیفیت کی حمایت سے معمور ہیں ایسے اشعار یا تو قطعات کی شکل میں ہیں یا طویل نظموں کا جزو ہیں۔

توحید

لفظ "اللہ"

کفار عرب اعلیٰ ترین طاقت کو لفظ "اللہ" کے ذریعہ بیان کرتے تھے۔ آگے چل کر یہی لفظ اسلام نے بھی اسی مفہوم ومعنی میں اپنا لیا۔ "اللہ" کا لفظ جاہلی شاعری میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ جو اس کا ثبوت ہے کہ قبل اسلام بھی یہ لفظ عام تھا، اور اس متذکرۂ بالا حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بلا شک وشبہ کہی جا سکتی ہے کہ اسلام سے پہلے اس لفظ میں وہی مفہوم پوشیدہ تھا جو اب اسلام میں ہے آئندہ سطور میں ہم تفصیل سے دیکھیں گے کہ زمانہ جاہلیت کے غیر مسلم عرب اور ان کی شاعری میں اس لفظ کی کیا اہمیت تھی۔

اللہ کی قسم

جاہلی شاعری میں ایسے اشعار بڑی کثرت سے ملتے ہیں جن میں خدا کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اور دراصل شاعری میں یہ لفظ بیشتر اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ قبل اسلام کے مشرکانہ معاشرہ میں قسم کی اہمیت اور ضرورت

مفصل روشنی ہم گذشتہ اوراق میں ڈال چکے ہیں۔ یہاں میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اللہ کی قسمیں کس نوع کی کھائی گئی ہیں۔ کیونکہ اس سے ہم کو کفار عرب کے توحیدانہ رجحانات کا جائزہ لینے میں مدد ملے گی۔ اگرچہ ایسے اشعار لاتعداد ہیں۔ لیکن میں ذیل میں صرف ممتاز شعراء کے کچھ اشعار درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

امرؤ القیس مختلف جگہوں پر کہتا ہے۔

فقالت یمین اللہ مالك حیلة ۔۔۔ وما إن أری عنك الغوایة تنجلی[۱]

(سو محبوبہ نے مجھکو دیکھکر کہا کہ بخدا مجھکو تیرے ٹالنے کا کوئی حیلہ دکھائی نہیں آتا۔ اور مجھکو امید نہیں کہ یہ عشق کی گمراہی تجھ سے دور ہو۔)

فقلت یمین اللہ ابرح قاعداً ۔۔۔ ولو قطعوا رأسی واوصالی[۲]

(چنانچہ میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں یہیں جمکر بیٹھا رہونگا خواہ لوگ تیرے سامنے میرا سر اور جوڑ جوڑ کاٹ ڈالیں۔)

اس طرح زہیر بن ابی سلمٰی کہتا ہے۔

تا اللہ قد علمت قیس اذا قذفت ۔۔۔ ریح الشتاء بیوت الحی بالعنن[۳]

(جب موسم سرما کی ہواؤں نے قبیلہ کے مکانات کو عنن پر پھینک مارا تو بخدا قبیلہ قیس نے جان لیا۔)

فو اللہ انا والأحالیف هؤلاء ۔۔۔ لفی حقبة اظفارها لم تقلم[۴]

(بخدا ہم لوگ اور ہمارے یہ تمام حلفاء ایک ایسے زمانہ میں ہیں جن کے ناخون کاٹے نہیں گئے)

---

[۱] شرح المعلقات للزوزنی ص ۱۸۔ [۲] دیوان امراؤ القیس ص ۵۷۔ [۳] دیوان زہیر ص ۱۲۱۔ [۴] ایضاً ص ۲۴

ذو الاصبع العدوانی کا درج ذیل شعر بھی استشہاد میں پیش کیا جاتا ہے۔

واللہ لو کرهت کفی مصاحبتی ۔۔۔ لقلت اذ کرهت قربی لها بینی[۱]

مذکورہ بالا اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ قسم کھانے کے لیے الفاظ کے کچھ مرکبات تھے۔ جو قبل اسلام کے معاشرہ میں رائج تھے۔ مثلاً اللہ کی قسم اللہ کی زندگی کی قسم، اللہ کا حلف۔ اور شعراء ان قسموں کا استعمال اپنے کلام میں جوش وزور بیان پیدا کرنے کے لیے کرتے تھے۔ کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ مواقع پر اللہ کی قسم اسکو شاہد بنانے کے ارادے سے یا باہمی معاہدوں کا نگراں بنانے کی نیت سے کھائی جاتی تھی، کیونکہ عوام کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا جو ہر جگہ حاضر وناظر ہے۔ ان لوگوں کو ضرور سزا دے گا۔ جو اس کی قسم کھا کر کئے ہوئے معاہدات کی خلاف ورزی کریں گے۔ مثال کے طور پر نابغہ ذبیانی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

فلما وقاها اللہ ضربة فأسه ۔۔۔ وللبر عین لا تغمض ناظره

فقال تعالی نجعل اللہ بیننا ۔۔۔ علی مالنا أو تنجزی لی آخره

فقالت یمین اللہ أفعل اننی ۔۔۔ رأیتك مسحوراً یمینك فاجره[۲]

(جب اللہ نے اسکو اس شخص کی کلہاڑی کی ضرب سے بچا دیا ــــ اور قسم کی آنکھ اپنے رکھنے والے سے اغماض نہیں برتتی ــــ تو اس نے کہا آ ہم لوگ خدا کو اپنے درمیان شاہد بنالیں وہ بولی بخدا میں اس کے لیے تیار نہیں کیونکہ میں تجھے دھوکہ باز اور قسم میں جھوٹا خیال کرتی ہوں)

استمداد ودعا کے لیے لفظ "اللہ" کا استعمال

جاہلی شاعری کا ایک دوسرا میدان جس میں لفظ "اللہ" کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ وہ استمداد ودعا ہے۔ اور

---

[۱] دیوان زہیر ص ۱۸۲۔ [۲] دیوان النابغہ ص ۶۳۔

جاہلی شاعری میں اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والا یہ واحد لفظ تھا۔ جہاں تک قسموں کا تعلق ہے۔ دوسرے دیوی دیوتاؤں کے نام بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن استمداد و دعا (Invocation) کے لیے ان بتوں اور دیوتاؤں کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

امرؤ القیس کہتا ہے۔

الا قبح اللہ البراجم کلھا ۔ وجدع یربوعا وعفر دارما[1]

(سن لو، اللہ تعالیٰ براجم کے تمام لوگوں کو رسوا کر دے اور یربوع کی ناک کاٹ دے اور دارم کو ذلیل کر دے)

عروہ بن الورد:

لحی اللہ صعلوکا اذا جن لیلہ ۔ مصافی المشاش آلفا کل مجزر[2]

(خدا ایسے نقیر پر لعنت کرے جو تاریکی پھیل جانے کے وقت نرم ہڈی اور ہر ذبح کو پسند کرے)

جزی اللہ خیرا کلما ذکر اسمہ ۔ ابا مالک ان ذلک الحی اصعد[3]

(ابو مالک کو خدا جزائے خیر عطا فرمائے۔ جب جب اس کا نام لیا جائے۔ بلاشبہ وہ قبیلہ بلند ہو گیا۔)

المرقش الاکبر:

لا یبعد اللہ التلبب والـ ... غارات اذ قال الخمیس نعم[4]

(جب لشکر کہے کہ یہ اونٹ ہیں تو خدا تیاری جنگ اور لوٹ مار کو ختم نہ کرے۔)

---

۱ دیوان امرؤ القیس ص ۱۲۰۔ ۲ دیوان عروہ ص ۱۵۔ ۳ ایضاً ص ۲۔ ۴ المفضلیات ج ۲ ص ۴۰۔

نابغہ الذبیانی:

جزی اللہ عبسا والجزاء بکفہ ۔ جزاء الکلاب العاویات وقد فعل[1]

(خدا قبیلہ عبس کو ایسا بدلہ دے، جیسا کہ بھونکنے والے کتوں کو دیا جاتا ہے۔ اور اس نے ایسا کر دیا ہے۔)

الاعشیٰ:

علیہ صلوۃ اللہ ما ھبت الصبا ۔ وما ناح طیر فوق غصن وغردا[2]

(اس پر خدا کی رحمت ہو۔ نہ تو ہوا چلی۔ اور نہ کسی شاخ پر پرندے نے نوحہ کیا اور نہ چہچہایا۔)

ورد الجعدی:

خلیلی عوجا بارک اللہ فیکما ۔ وان لم تکن ھند لارضکما قصدا[3]

(میرے دونوں دوستو! مقیم ہو جاؤ۔ خدا تم میں برکت عطا فرمائے۔ اگرچہ ہند تمہاری سرزمین کا قصد نہ کرے۔)

برج المشیر الطائی:

فسائل ھداک اللہ ای بنی اب ۔ من الناس یسعی سعینا ویقارض[4]

(لوگوں سے پوچھو — خدا تم کو ہدایت دے — لوگوں میں سے کس باپ کا بیٹا ہماری طرح کوشش کرتا اور برائی کا برائی سے مقابلہ کرتا ہے۔)

حاتم الطائی:

سقی اللہ رب الناس سحا و دیمۃ ۔ جنوب السراۃ من مآب الی زغر[5]

---

۱ دیوان نابغہ ص ۸۵۔ ۲ دیوان الاعشیٰ ص ۲۳۹۔ ۳ دیوان الحماسہ لابی تمام ج ۲ ص ۱۱۔ ۴ ایضاً ج ۱ ص ۳۴۹۔ ۵ دیوان حاتم ص ۱۳

(اللہ تعالےٰ جو مخلوق کا پروردگار ہے۔ آب سے زوعنگ جنوب سمرات کو برستی ہوئی بدلی سے سیراب کرے۔)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کی دعا یا بددعا کے لیے کچھ متعین اصلاحات تھیں جن کو شعرأ عموماً بغیر لغوی معنی کا لحاظ کیے ہوئے استعمال کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ کچھ ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جن میں شاعروں نے اپنی کسی مقصد برآری یا حصول کامیابی کے لیے خدا سے دعا مانگتے ہوئے لفظ اللہ کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً نابغہ الذبیانی خدا سے اپنے ممدوح شاہ حیرہ نعمانی کی درازی عمر کی دعا مانگتے ہوئے کہتا ہے۔

نحن لدیہ نسأل اللہ خلدہ ۔۔۔ یرد لنا ملکا و للأرض عامرا[1]

(ہم خدا سے اس کی زندگی جاوداں کی دعا کرتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے بادشاہ کو واپس لوٹا دے جو زمین کو آباد کرنے والا تھا۔)

خدا سب سے عظیم ہے

اب ہم کو دیکھنا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب خدا کو کن طاقتوں اور اوصاف کا حامل سمجھتے تھے۔ اور اس کی جھلک کس حد تک ان کی شاعری میں ملتی ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری نگاہ سب سے پہلے ان اشعار پر پڑتی ہے جن میں شاعر کا خدا کی عظمت و قدرت پر عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ نابغہ الذبیانی کہتا ہے۔

خلفت فلم اترک لنفسک ریبۃ ۔۔۔ ولیس وراء اللہ للمرء مذھب[2]

اس شعر میں نابغہ اپنے مربی کو دھیان دلاتا ہے کہ اب میں نے قسم کھا لی ہے۔ چنانچہ تمہارے لیے میں نے شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے اور اللہ کے بعد انسان کی کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں ہے۔ شاعر اس بات پر زور دینا چاہتا ہے کہ چونکہ اس نے

[1] دیوان نابغہ ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۱۶

اللہ کی قسم کھائی ہے لہٰذا اس کے سرپرست کو اس پر کامل اعتماد کرنا چاہیے چونکہ اللہ کی قسم کے بعد (جو سب سے عظیم ہے) اس سلسلہ میں دوسری راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہاں لبید کے درج ذیل اشعار بھی قابل توجہ ہیں، شاعر نے لفظ اللہ کے ساتھ ایک ایسی صفت وابستہ کی ہے جس کا مفہوم "عظیم ترین" ہے۔

واکذب النفس اذا حدثتھا ۔۔۔ إن صدق النفس یزری بالأمل

غیر أن لاتکذ بنھا فی التقی ۔۔۔ واخزھا بالبر للہ الأجل[1]

(اور نفس کے ساتھ جھوٹ بولو جب اس سے بات کرو کیونکہ نفس کے ساتھ سچ بولنا امیدوں کو کوتاہ کر دیتا ہے۔ ہاں مگر پرہیزگاری اور خدا سے ڈرنے کے بارے میں اس سے جھوٹ نہ بولو اور اللہ جل شانہٗ کے حقوق ادا کرنے میں اسے دباؤ۔)

درج ذیل شعر میں اوس بن حجر کچھ بتوں اور ان کے پیرووں کی قسم کھانے کے بعد اللہ کی بھی قسم کھاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اللہ ان سب میں برتر و عظیم ہے۔

وباللات والعزی ومن دان دینھا ۔۔۔ وباللہ إن اللہ منھن اکبر

(لات و عزی اور ان کے ماننے والوں کی قسم اور اللہ کی قسم۔ بلاشبہ اللہ ان سے بڑا ہے۔)

خدا ایک ہے

ذیل میں لبید کے چند بہت مشہور و اہم مذہبی اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا گیا ہے۔

فواعجباً کیف یعصی الالہ ۔ ۔ ۔ ۔ أم کیف یجحدہ الجاحد

وفی کل شیٔ لہ آیۃ ۔۔۔ تدل علی أنہ واحد

وللہ فی کل تحریکۃ ۔۔۔ وتسکینۃ ابداً شاھد

[1] دیوان لبید (طبع لیڈن) ص ۱۲

شاعر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کیسے کی جاسکتی ہے۔ یا کوئی اس کی ذات سے انکار کس طرح کرسکتا ہے۔ جب کہ ہر چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک ہے۔ اور ہر ساکن و متحرک چیز میں اس کی ذات کی شہادت موجود ہے۔

سب لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ | قبل اسلام کے عربوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جن کے ناموں کا مطلب "اللہ" کا بندہ (عبداللہ) ہوتا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے خدا کے ساتھ تعلق کے نظریے پر روشنی پڑتی ہے۔ کچھ اشعار میں بھی اس طرح کے خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً عبدیغوث اپنے درج ذیل شعر میں عوام کو خدا کا بندہ کہکر مخاطب کرتا ہے۔

احقاً عباد اللہ أن لست سامعاً [۱]   نشید الرعاء المعزبین المتالیا

(اے اللہ کے بندو! کیا میں اہل وعیال سے دور پڑے ہوئے چرواہوں کی آواز کو واقعی نہیں سنوں گا)

اس طرح ذیل کے شعر میں الاعشی بھی خدا کی قسم کھاتے ہوئے خود کو اس کا بندہ تسلیم کرتا ہے۔

فاقسم باللہ الذی أنا عبدہ   لتصطفقن یوماً علیک الماتم

(میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کا میں بندہ ہوں کہ تم پر کسی دن غمزدہ لوگ ضرور تالی بجائیں گے)

(باقی)

---

[۱] المفضلیات ج ۱ ص ۱۵۵۔

رجال السند والہند (عربی)

پہلی صدی سے ساتویں صدی ہجری تک کے ہندوستانی اور صوبہ سندھ کے اہل ارباب کمال کا تذکرہ و تعارف جنکا تصنیفی زبان عربی تھی مولفہ۔ قاضی اطہر مبارکپوری۔ قیمت :- عہ ر

باب التقریظ والانتقاد

دکن کے عہد وسطیٰ کی تاریخ

جلد اول

(سنہ ۱۲۹۵ء - سنہ ۱۷۲۴ء)

از صباح الدین عبد الرحمن

ہندوستان میں پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ تاریخ نویسی کا ذوق برطانوی حکومت کے زمانہ میں پیدا ہوا، خود انگریزوں نے اس ملک کی تاریخ لکھنے میں بڑی دلچسپی اور سرگرمی کا اظہار کیا، اور ہندو اور مسلمان دونوں حکمرانوں کی عہد کی تاریخیں مرتب کیں اس سلسلہ میں ونسنٹ اسمتھ، الفنسٹن، ہنری الیٹ، گرینڈ ڈف، ٹاڈ، ارادرنی، ولیم ارسکن، لین پول، فرانسس گلیڈ ون، چارلس اسٹورٹ، بلاخ من، کننگھم، ہیول، ہری براؤن، راش بروک ولیم، اور ایچ بیورج وغیرہ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں، مگر ان میں زیادہ تر ایسے مورخین تھے، جنھوں نے ہمارے ملک کی تاریخ قلمبند کرنے میں اپنے سیاسی مفاد کو پیش نظر رکھا اور سارے تاریخی واقعات کو اس طرح مرتب کیا کہ پڑھنے والوں پر یہ اثر قائم ہو کہ پہلے کی حکومتوں کے مقابلہ میں ان کی حکومت ایک سایۂ رحمت ہے، ہندوؤں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی خاطر مسلمانوں کی حکومتوں کی تاریخ لکھنے میں بڑی رنگ آمیزی کی، تاریخ نویسی ایک معصوم فن تھا، مگر انگریز مورخوں نے اس کو اپنی سیاست کا کھیل بنادیا، مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تاریخی واقعات کو الٹ پلٹ کر کچھ اس طرح لکھا، بچھایا اور پڑھوایا کہ جو دل

ان واقعات کو بڑھا کر توڑے، وہ جوڑ نہ سکے، لیکن ان کی مصلحت اندیشانہ تاریخ نویسی سے جو مضرت رساں اثرات پیدا ہوئے، ان کا احساس ہندوستانی مورخوں کو ہوا۔ تو اسی دور میں انھوں نے کچھ ایسی تاریخیں لکھیں جن سے یہ تلخیاں بڑی حد تک دور ہوئیں، ان میں ان لا تاراچند، ایشوری ٹوپا، کالکارنجن قانون گو، رام پرشاد ترپاٹھی، بینی پرشاد، بنارسی پرشاد سکسینہ، رام پرشاد کھوسلا اور ایس، کے بنرجی وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر آئندہ بھی برابر یاد رکھے جائیں گے۔

انگریزوں نے تاریخ کے کچھ مواد سے جو استدلال کئے یا ان سے جو نتائج استنباط کئے ان کے اثرات بہت کچھ ابھی تک باقی ہیں، لیکن ہندوستان کے مورخوں کو اس کا احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ ملک کے ماضی کی تاریخ ان ہی کے نقطۂ نظر سے لکھی جانی چاہئے، اس سلسلہ میں ہندو مورخوں کا شعور زیادہ بیدار ہوا، انھوں نے ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ اس طرح مرتب کر دی ہے کہ اس عہد کی بہت ہی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آگئی ہیں، ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہونے لگا ہے کہ یہ دور بہت ہی مہذب اور ترقی یافتہ تھا، تاریخ نویسی کا ذوق ہندوؤں میں مسلمان حکمرانوں کے زمانے ہی میں پیدا ہوا، اس سے پہلے تاریخ لکھنے سے ان کو دلچسپی نہیں رہی، لیکن موجودہ دور میں انھوں نے اس کی پوری تلافی کر دی ہے، اور نہ صرف ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ لکھنے میں اپنے انہماک کا ثبوت دیا ہے، بلکہ مسلمانوں کے دور حکومت کا بھی کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیاں نہیں دکھائی ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد سے متعلق مسلمان مورخین سے زیادہ انھوں ہی نے کتابیں لکھ کر ڈھیر لگا دی ہیں، اسی لئے ہندوستان کے ہر دور کے ہر موضوع پر تاریخیں بہت کچھ لکھی جا چکی ہیں، اور جو باقی ہیں وہ قلمبند ہو رہی ہیں،

مذکورۂ بالا کتاب دکن کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کی پہلی جلد بھی انھی مساعی جمیلہ کا ایک شاندار نتیجہ ہے، یہ آندھرا پردیش کی حکومت کی طرف سے شائع ہوئی ہے، اس کی تدوین باضابطہ ایک بورڈ کی طرف سے ہوئی ہے، جس کے اڈیٹر پروفیسر ہارون خاں شروانی اور جوائنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر پی ام جوشی ہیں، پروفیسر ہارون خاں شروانی کا شمار ہندوستان کے بہت ہی ممتاز اور نمایاں مورخوں میں ہوتا ہے، وہ اپنی تحقیق کی کہنہ مشقی اور نقطۂ نظر کی اعتدال پسندی کی وجہ سے ہر طبقہ میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ جو کتاب ان کی نگرانی میں شائع ہوگی وہ نہ صرف پورے معیار کی ہوگی، بلکہ امید ہے کہ ہر طبقۂ خیال میں مقبول بھی ہوگی،

اس تاریخ کے مختلف ابواب کو مختلف مشہور مورخوں نے لکھا ہے، جیسا کہ حسب ذیل فہرست سے ظاہر ہوگا،

(۱) عہد وسطیٰ کے دکن کا تاریخی جغرافیہ از ڈاکٹر پی ام جوشی بمبئی (۲) دکن میں خلجی اور تغلق از ڈاکٹر پی ام جوشی بمبئی اور ڈاکٹر اے مہدی حسن، کلکتہ، (۳) سلطنت معبر از ڈاکٹر پی ایس اے، کیو، حسینی، مدورائی (۴) وجیانگر از ڈاکٹر آر۔ سبرامنیم حیدرآباد ضمیمہ تاسیس وجیانگر از ڈاکٹر بی اے دیسائی، دھاروار، (۵) بہمنی خاندان از پروفیسر ایچ کے شیروانی ضمیمہ، بہمنیوں کے عہد کے اقتصادی اور معاشرتی حالات از ڈاکٹر پی ام جوشی بمبئی، (۶) نظام شاہی اور عماد شاہی خاندان از ڈاکٹر رادھے شیام الہ آباد (۷) عادل شاہی اور بریدی حکمراں، از ڈاکٹر پی، ام جوشی بمبئی، ضمیمہ عادل شاہیوں کے دور میں معاشرتی اور اقتصادی حالات از ڈاکٹر پی، ام جوشی، بمبئی، (۸) قطب شاہی حکمراں از پروفیسر ہارون خاں شروانی حیدرآباد (۹) خاندیس از ڈاکٹر پی، ام جوشی بمبئی، (۱۰) سلطنت ریڈی اور دوسری چھوٹی ریاستیں، از ڈاکٹر ان رامیش، حیدرآباد (۱۱) مرہٹے از ڈاکٹر اے آر کلکارنی (۱۲) دکن میں مغل ۱۶۳۶-۱۶۸۷ء از پروفیسر کے ساجن لال حیدرآباد،

مسلمانوں کے دورِ حکومت کے کسی پہلو پر کسی ہندو مورخ کی تحریر سامنے آتی ہے تو اس
کے مطالعہ کے وقت یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں اس میں تنقیدوں اور تبصروں کے نیش خار اور
نوکِ سوزن تو نہیں، اسی لئے پہلی نظر تو اس کتاب کے ان ابواب پر گئی جن میں ہندو مورخوں
نے دکن کے مسلمان فرمانرواؤں کی تاریخ قلمبند کی ہے، ان کے مطالعہ کے بعد اطمینان ہوا
کہ ان مورخوں نے اپنی تحریروں میں توازن اور اعتدال قائم رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی
ہے، سلاطین دہلی میں علاء الدین خلجی اور مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب سے متعلق ہندو
مورخین کے قلم سے تیز و تند اور زہریلے جملے ضرور نکل جاتے ہیں، علاء الدین خلجی اور ملک کافور
نے دہلی کی سلطنت کی توسیع کے سلسلہ میں جنوبی ہند میں جو لشکر آرائی کی وہ مسلمان مورخوں
کی نظر میں تو ان دونوں کا بڑا شاندار کارنامہ ہے، جس کو قلمبند کرنے میں ان کا قلم
بڑا ہی شگفتہ ہو جاتا ہے، مگر جنوبی ہند کے ہندو مورخین کے قلم سے اس مہم کے ذکر میں ناگواری
کا اظہار ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں، مگر قلم کی اس شگفتگی اور ناگواری کے اظہار کے
وقت یہ سوچنا چاہئے کہ اس سے تاریخ نویسی کی دیانت داری کا حق ادا ہوتا ہے، یا
اس میں نسلی تعصب اور شخصی جذبات یا محرور المزاجی کا دخل ہو جاتا ہے، لیکن زیر نظر کتاب
میں ڈاکٹر پی ایم، جوشی نے خلجیوں کی فوجی سرگرمیوں کی جو تفصیلات لکھی ہیں،
ان میں کسی قسم کی ناخوشگواری کا اظہار نہیں ہے، بلکہ واقعات کو واقعات کی حقیقت
کی روشنی میں دکھلانے کی کوشش کی ہے، یہ حقیقت شناسی دوسروں کے لئے باعث
ہدایت ہو سکتی ہے، جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی کی فوجی مہم کا ذکر عصامی نے فتوح السلاطین
اور امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں بہت ہی ولولہ انگیز طریقہ پر کیا ہے، دیوگیر کے راجہ
رام دیو کے تعلقات علاء الدین خلجی سے بہت ہی اچھے ہو گئے تھے، عصامی نے اس کا

ذکر "سرفراز ہنود" اور "بندہ خاص درگاہ شاہ" لکھ کر کیا ہے، عصامی کا یہ بھی بیان ہے کہ جب
رام دیو علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا، اس پر موتی نچھاور
کئے گئے، دو لاکھ تنگے نذر دیئے گئے، رائے رایان کا خطاب اور کچھ دنوں کے بعد چتر بھی دیا گیا
(فتوح السلاطین، آگرہ اڈیشن ص ۲۷۲) شہزادہ خضر خاں کی شادی الپ خاں کی لڑکی سے ہوئی
تو اس "تقریب جشن" میں رام دیو بھی مدعو کیا گیا، وہ اور ہندو راجاؤں کے ساتھ اس میں
شریک ہوا، (فتوح السلاطین ص ۳۱۲) اسی سال یعنی ۱۳۱۲ء میں سلطان علاء الدین خلجی
نے ملک کافور کی نگرانی میں دھور سمندر بھی ایک فوج بھیجی تو رائے رایان رام دیو نے
شاہی لشکر کی ہر قسم کی مدد کی، امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں اسکی تعریف "رائے
اصل برائے اصیل اور رائے نیک اصل کہ نہال کردہ روزگار خلافت پناہ است" لکھ کر
کی ہے، اور پھر لکھا ہے کہ جب شاہی لشکر دھور سمندر جاتے ہوئے دیوگیر سے گذرا تو رام دیو
نے پورے اخلاص سے شہر دیوگیر کو فردوس کی طرح آراستہ کیا، اور حکم دیا کہ لشکر کی ضروریات کی
تمام چیزیں موجود رہیں، اور اگر شاہی لشکر کے پہلوانوں کو اپنے تیروں کے لئے سیمرغ کے پر
کی ضرورت ہو تو بھی فراہم کئے جائیں تاکہ دھور سمندر اور معبر کو زیر کیا جاسکے، دیوگیر کا
بازار بوستان ارم کی طرح آراستہ کیا گیا کہ جب شاہی لشکر کے سوار اس میں سے گذریں تو
انکو معلوم ہو کہ بہشت شداد سے گذر رہے ہیں، بازار کا ہر حصہ نئے انداز سے سجایا گیا، صراف
سونے چاندی کے سکے لئے بیٹھے تھے، بزازوں نے ہندوستان اور خراسان کے عمدہ کپڑوں
کی دکانیں لگا رکھی تھیں، پھلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ان میں بعض تو انار سے زیادہ شیریں
اور آم سے زیادہ بہتر تھے، لشکریوں کے لئے اون، چمڑے اور لوہے کی ساری چیزیں رکھی
ہوئی تھیں کہ مناسب قیمتوں پر خریدی جاسکیں، عدل و انصاف ایسا تھا کہ

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے — نہ ہندو را مخالف بود رائے

رائے رایان رام دیو نے اپنے ایک فوجی سردار پرسو رام دیو کو ہدایت دی کہ وہ شاہی لشکر کو دھور سمندر تک پہنچانے میں ہر قسم کی مدد کرے، (خزائن الفتوح ص ۱۳۸-۱۳۶) دھور سمندر کی طرف شاہی فوج بڑھی تو وہاں کے راجہ کے خاندان میں اختلاف تھا، دو بھائی سندر پانڈیا اور ویر پانڈیا تھے، دونوں تخت کے دعویدار ہوئے تو سندر پانڈیا نے علاء الدین خلجی کی امداد طلب کی، ویر پانڈیا نے شاہی لشکر کا مقابلہ کیا، پھر صلح کر لی، اور شاہی لشکر کا بہت بڑا معاون ہو گیا، جب فوج نے معبر کی طرف کوچ کیا تو ویر پانڈیا نے اس کی رہبری کی، عصامی اس کو "فخر رایان ہندوستان" بتاتا ہے، اس سے صلح ہوتی ہو تو عصامی لکھتا ہے:۔

بے خدمتے پیش کردہ بلال — چہ اسپ و چہ گوہر چہ پیل و چہ مال

رواں شد سوئے نائب خاص شاہ — بپوسید پایش در اثنائے راہ

ملک کافور بھی اس کے ساتھ بڑی عنایتوں سے پیش آیا، اور خلعت عطا کیا،

چو دیدش ملک نائب سرفراز — کہ دشمن شکن بود و مہماں نواز

بہ صد پرسش و عذر بنواختش — چو صاحب کلاہاں سرافراختش

یکے خلعت اور اگر انمایہ داد — در لطف و اکرام بر وے کشاد

کچھ دنوں کے بعد راجہ بلال یعنی ویر بلال دیو سے کہا گیا کہ جب وہ شاہی لشکر کا دل و جان سے یار ہو گیا ہے، تو وہ معبر کی طرف لشکر کشی میں شاہی فوج سے تعاون کرے، وہ اس کے لئے راضی ہو گیا، عصامی نے راجہ کو فخر رایان ہندوستان اور فخر ہندوستان کہا ہے، (فتوح السلاطین ص ۲۸۷)

پس از ہفتہ گفتش آں کامراں — کہ اے فخر رایان ہندوستاں

تو چوں از دل و جاں شدی یار ما — دل و جان تو با دعشرت گرا

کنوں بشنو اے فخر ہندوستاں — چنین است فرمان شاہ جہاں

کہ ایں یار ہمراہ لشکر شوی — زنی کوس و در سمت معبر شوی

اس کے بعد معبر بھی فتح ہو گیا، اس طرح دھور سمندر اور معبر کی فتوحات میں راجہ رام رایان رام دیو، پرس دیو دیوے اور راجہ ویر بلال کا بھی تعاون رہا، اس قسم کے واقعات کے ذکر سے ہندوستان میں جذباتی ہم آہنگی کی موجودہ تحریک کو مدد مل سکتی ہے، ڈاکٹر پی ام جوشی نے اپنے مقالہ میں خزائن الفتوح اور فتوح السلاطین کے حوالے تو دیئے ہیں، لیکن مذکورۂ بالا تفصیلات کو معلوم نہیں کیوں نظر انداز کر دیا ہے، انھوں نے یہ لکھا ہے کہ مدورا کے حملے میں ملک کافور کو وکرم پانڈیا سے شکست ہوئی، (ص ۸۴) لیکن اس کی تائید معاصر فارسی تاریخوں سے نہیں ہوتی ہے، ان کے محتاط قلم سے دیوگیر کے ذکر میں یہ تحریر بھی نکل پڑی ہے کہ پہلے تو اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں اس مذہب کا قبول کرنا مرضی کے مطابق رہا، لیکن بعد کو سیاسی قوت مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی تو تبلیغ کی سرگرمیوں میں مبلغین اور حکمرانوں نے شاید مقابلۃً جارحانہ پالیسی اختیار کی، (ص ۱۸۱) اس کے لئے فاضل مورخ نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، اور لفظ شاید لکھ کر اس حقیقت کے عدم وثوق کا بھی اظہار کر دیا ہے، لیکن اس غیر مستند بات کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ایسی باتیں قلمبند کرنے سے خواہ مخواہ مذہبی اور نسلی نفرت پھیلتی ہے، مورخ کا مقصد باہمی نفرت پھیلانا ہرگز نہ ہونا چاہیئے، اسی خیال سے انھوں نے بھی بہمنی حکمرانوں کے عہد کے معاشرتی اور اقتصادی حالات کے عنوان کے باب میں لکھا ہے کہ ہندو مذہب کو مسلمان حکمراں مخالفانہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے، (ص ۲۰۸) گو وہ اسی باب میں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اس زمانہ میں عام

ہندو اور خصوصاً برہمن حکمراں طبقہ کے ذبیحہ گاؤ اور کبھی کبھی ان کی بت شکنی کی سرگرمیوں سے سراسیمہ رہے، (ص ۴۰۹) اس کتاب کے فاضل اڈیٹر پروفیسر ہارون خاں شروانی کو بھی اسکا احساس ہے کہ اس قسم کی تحریر مضرت رساں ہوتی ہے، اسی لئے اس باب میں محمد بن تغلق کے عہد میں ہر ہیرا اور بکہ کے قبول اسلام کا ذکر آیا ہے، تو انھوں نے اس کے نیچے یہ حاشیہ لکھدیا ہے کہ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے (ص ۵۰۳) نئی تحقیقات میں جبری تبلیغ اسلام بت شکنی اور انہدام مندر ایک فرسودہ موضوع ہو چکا ہے، ان کا ذکر کرکے بادقانہ تحریر کو محض داغدار کرنا ہے،

ڈاکٹر کے، ساجن لال نے اس کتاب کے بارھویں باب میں دکن میں اورنگ زیب کی سرگرمیوں کا جو تجزیہ کیا ہے، وہ مختصر ضرور ہے لیکن بہت ہی جامع اور پُرمغز ہے، اس سے بیجاپور اور گولکنڈہ سے متعلق اس مغل بادشاہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں دور ہو جائینگی، ڈاکٹر ساجن لال نے یہ دکھایا ہے کہ ان ریاستوں کے خلاف اورنگزیب کا رویہ کسی مذہبی تعصب کی بناء پر نہ تھا، بلکہ خالص سیاسی اور اقتصادی اسباب کارفرما ہے (ص ۶۰۳-۶۰۴) انھوں نے عام مورخوں کی طرح اورنگ زیب کے متعلق ناخوشگوار اور ناروا الفاظ بھی استعمال نہیں کئے ہیں، بلکہ پورا باب مورخانہ سنجیدگی اور ناقدانہ متانت کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے، وہ اورنگ زیب سے متعلق جادو ناتھ سرکار کی مخالفانہ رائے سے متاثر نظر نہیں آتے، ورنہ عام طور سے مورخین اورنگ زیب کو جادو ناتھ سرکار ہی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، جنھوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیاں یہ لکھ کر دکھائی ہیں، کہ اورنگزیب حکمراں کی حیثیت سے ایسا بدترین ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا" (اسٹڈیز ان موغل انڈیا جادو ناتھ سرکار ص ۴۲-۵۰) اس ریویو میں یہ بات اپنے موضوع

سے ہٹ کر آجائیگی، اگر یہاں پر قلمبند کیا جائے کہ جادو ناتھ سرکار صرف اورنگزیب کو برا کہنے پر اکتفا کرتے تو یہ سمجھا جاتا کہ مورخ کی حیثیت سے ان کو اپنی رائے قائم کرنے کا حق تھا مگر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "ہسٹری آف اورنگزیب" کی تیسری جلد کے ۳۴ ویں باب "اسلامک اسٹیٹ چرچ ان انڈیا میں" اسلام اور اسلامی حکومت کا جو تخیل ادھر ادھر کے غیر مستند حوالوں سے پیش کیا ہے، اسکو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اورنگزیب کی آڑ لیکر اسلام اور اسلامی تاریخ کو بھی بدنام بلکہ مسخ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، اس میں انھوں نے جہاں اور بہت سی دل آزار باتیں لکھی ہیں وہاں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے، جس کی بنا پر وہ لوٹ مار اور قتل کو خدا کی راہ میں انسانیت کا خالص ترین فعل سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں ...... ایک مذہب جو اپنے پیروؤں کو ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے، (جلد سوم ص ۲۸۳-۲۸۴)

یہ زہرناک تحریر صرف انگریزوں کو خوش کرنے کیلئے لکھی گئی، کیونکہ وہ اپنی اسی کتاب کے جلد اول میں یہ [illegible]:

"اورنگزیب کے عہد حکومت میں جب مغلوں کا ہلال بدر کامل ہو گیا تھا، زوال دکھائی دینے لگا، اور ایک نئی صبح کی روشنی ہمارے سیاسی آسمان پر ظاہر ہونے لگی، ہمارے ملک کے مستقبل کے مالکوں نے اس سرزمین میں مستحکم اور محفوظ قدم جما لیا، مدراس اور بمبئی میں ۱۶۵۳ء اور ۱۶۸۷ء میں ایسٹ انڈیا کے ماتحت دو پریسیڈنسیاں ہو گئیں، اُن پناہ گاہوں کی وجہ سے یوروپینوں نے سلطنت کے اندر سلطنت بنالی، اور وہاں محفوظ ہو کر ملک کی اندرونی قوتوں کی خلاف ورزی کرنے لگے، یہاں جانباز سوداگروں نے مشرقی حکومت اور قانون سازی میں اپنے تجربے شروع کر دیئے، رفتار زمانہ کے ساتھ ان تجربوں سے ایک ایسا امپائر وجود میں آیا، جو رومن امپائر سے بڑا تھا اور چارلس پنجم کے امپائر سے زیادہ

آباد تھا، اور اس میں ایسا متمدن اور ترقی پسند نظام سلطنت قائم ہوا جس کی مثال نہ عہد قدیم اور نہ دور جدید میں دنیا پیش کر سکی۔"

انگریزوں کی حکومت کی مدح سرائی کی خاطر وہ ہسٹری آف اورنگزیب کی پانچ اور فال آف دی موغل امپائر کی چار جلدوں میں واقعات کی ماہرانہ تنظیم و ترتیب کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے گئے ہیں، کہ ہسٹری آف اورنگ زیب سے تو ہندوؤں کو مسلمانوں اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے باہمی نفرت پیدا ہوتی ہے، اور فال آف دی موغل امپائر میں راجپوتوں کو مرہٹوں اور مرہٹوں کو راجپوتوں اور مسلمانوں کو مرہٹوں اور مرہٹوں کو مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز جذبات ابھرتے ہیں، اور جس طرح مسلمانوں کے دور حکومت کے مورخوں کی تحریروں سے آج کل کے ہندوؤں کو اشتعال پیدا ہوتا ہے، اسی طرح جادو ناتھ سرکار کی تحقیقاتی سرگرمیوں سے تکدر اور آزردگی پیدا ہونا ناگزیر ہے، آگے چل کر جب ہندوستان کی تاریخ کے تحقیقاتی گوشے بہت ہی صاف اور واضح ہو کر ناظرین کے سامنے آئیں گے، تو جادو ناتھ سرکار کی ساری تحقیقات ہندوستان کی متحدہ قومیت کی تشکیل اور فروغ میں بہت ہی مضرت رساں قرار دیجائیں گی، مگر ابھی تو عام مورخوں کے دماغ اور تحقیقات پر اورنگزیب سے متعلق جادو ناتھ سرکار نے جو ذہن بنایا ہے وہی چھایا ہوا ہے، حالانکہ مولانا شبلی کی اس رائے میں بڑا وزن ہے، کہ عالمگیر کی جو تصویر اسکے مخالفوں نے کھینچی ہے اس میں تمام تر تعصب اور عداوت کا رنگ بھر گیا ہے، موجودہ دور کے مورخین اورنگ زیب سے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے وہ سوچیں کہ وہ تاریخ نویسی کا حق ادا کر رہے ہیں یا اپنے ذاتی تعصب اور عداوت کا رنگ بھر رہے ہیں،

زیر نظر کتاب میں جادو ناتھ سرکار کے حوالے کافی آئے ہیں، مگر مجموعی حیثیت سے مغلوں یا اورنگزیب سے متعلق تعصب اور عداوت کا رنگ نہیں آنے پایا ہے، البتہ اس کتاب کے

گیارہویں باب میں ڈاکٹر اے آر کلکارنی نے سیواجی کی تاجپوشی کے سلسلہ میں جو حسب ذیل باتیں لکھی ہیں، وہ اگر نہ لکھتے تو ان کی پوری تحریر کے وزن میں کوئی فرق نہیں آتا،

"سیواجی کی تاجپوشی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے سبھاسد نے لکھا ہے کہ ابتک اس عہد میں زمین پر ملیچھ شاہنشاہی حکومت کرتے رہے، لیکن اب ایک پہلا مرہٹہ بادشاہ ہوا جس نے شہنشاہ کا رتبہ اختیار کیا، یہ واقعہ معمولی اہمیت کا نہ تھا۔" (ص ۱۷۵)

ایسی تحریر تو جادو ناتھ سرکار ای کے بنائے ہوئے ذہن کی عکاسی کرتی ہے تعجب ہوتا ہے کہ اب بھی ایسے مورخین ہیں جو ایسی تحریریں لکھ جاتے ہیں مثلاً موجودہ دور میں آر۔ سی موزمدار بہت ہی لائق مورخ سمجھے جاتے ہیں، وہ ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل کی جلد پنجم کی تمہید (ص ۷۰) میں لکھتے ہیں،

"گیارہویں صدی کے شروع ربع میں ہندوستان کے لئے ایک بڑا المیہ پیش آیا یا تھا جس سے مستقبل میں بڑے نتائج پیدا ہوئے، اس سے نہ صرف ہندوستان کی دولت لٹ گئی اور باقی رہی، بلکہ مسلمانوں کو پنجاب میں مستقل طریقے سے پاؤں جمانے کا ایک موقع مل گیا جہاں سے انکو اندرون ملک کیلئے ایک شاہراہ مل گئی،..... کچھ ہندوؤں نے مسلمانوں کو شکست دی اور انکی جارحانہ معرکہ آرائیوں کو روکا، ان راجاؤں میں سے ایک نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے ملیچھوں (یعنی مسلمانوں) کو نکال باہر کیا ہے، تاکہ یہ آریہ ورت کا نام پورا پورا اس پر صادق ہو، اور یہ آریاؤں کا مسکن رہے، لیکن اس قسم کے قومی شعور کی مثالیں کم ملتی ہیں، اسلیئے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈینگ ہانکنے کے بجائے ہندو راجاؤں نے مل کر اسکی کوشش نہیں کی کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیتے اپنے گوشت سے کانٹا نکال پھینکنے کے بہت سے مواقع آئے اجبکہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا تھا..... لیکن وہ طاقتور ہندوستانی راجاؤں کو نقصان پہنچا کر اپنی حکومت کے دائرے کی توسیع کی فکر میں لگے رہے

اور انھوں نے اس قومی فریضہ کے انجام دینے کی طرف مل کر پوری توجہ نہیں کی، کہ ایک غیر ملکی مذہب کے بیرونی لوگوں کی غلامی سے پنجاب کو آزاد کراتے"۔

مورخوں کی اس قسم کی دل آزار تحریروں سے ہندوستان کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، مورخوں کو اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنا پورا حصہ ادا کرنا ہے، خوشی کی بات ہے کہ زیر نظر کتاب میں ایسی ناخوشگوار باتیں حتی الامکان لکھنے سے پرہیز کیا گیا ہے، جس کے لئے اس کے مرتب مبارکباد کے مستحق ہیں،

زیر نظر کتاب میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کے دو مقالات "بہمنی" اور "قطب شاہی" کے عنوانات سے ہیں، وہ دکن کی تاریخ کے بہت ہی مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں اور وہاں کے سلاطین خصوصاً بہمنی اور قطب شاہی فرمانرواؤں کے عہد کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور علمی حالات لکھ کر ان کے کارناموں کو موجودہ دور میں زندہ جاوید کر دیا ہے، ان کی تحریروں میں قابل قدر متانت اور سنجیدگی ہوتی ہے، اس کتاب میں ان دو خاندانوں کی تاریخ قلمبند کر کے اپنی تحریر کے ایجاز کا اعجاز دکھایا ہے، ان کے اجمال میں ساری تفصیل آگئی ہے، ڈاکٹر اس اے ایکو حسینی نے معبر کی تاریخ سکوں اور کتبات سے مرتب کر دی ہے، ان کی یہ محنت اور کاوش ان مورخوں کے لئے باعث عبرت ہے جو اپنی تحقیقات میں سہل انگاری سے کام لینے کے عادی ہو گئے ہیں، جس طرح ڈاکٹر پی ایم جوشی نے بہمنی اور عادل شاہی حکمرانوں کے عہد کے معاشرتی اور اقتصادی حالات قلمبند کر کے اس کتاب کو باوزن بنایا ہے، اسی طرح ڈاکٹر رادھے شیام کے مقالہ نظام شاہی اور عماد شاہی حکمرانوں کے عہد میں بھی اقتصادی اور معاشرتی حالات کی تاریخ قلمبند کر دیجاتی، تو اس کتاب میں کوئی کمی باقی نہ رہتی،

تمام مقالات پورے تاریخی شواہد اور اسناد کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں، اگر حوالوں میں ثانوی ماخذوں کی بھی فراوانی ہے، جس سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں آیندہ معاصر ماخذوں کی اہمیت ثانوی ماخذوں کی کثرت سے نظر انداز نہ ہو جائے،

پوری کتاب ۶۵۳ صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں دکن کا ایک نقشہ بھی منسلک کر دیا گیا ہے، قیمت ایک سو دس روپیہ ہے، پرنٹنگ اینڈ پبلیکیشن بیورو گورنمنٹ آف آندھرا پردیش، چنچل گوڑا، حیدر آباد ۳۶ ... سے مل سکتی ہے،

یہ کتاب جس محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے کسی بھی کتب خانہ کے لئے زینت بن سکتی ہے،

مطبوعات جدیدہ

معراج العاشقین کا مصنف - از، ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۸۰، قیمت تحریر نہیں غالباً مصنف سے شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے ملے گی۔

اسمیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی جانب معراج العاشقین کی نسبت کو غلط قرار دیکر اسے دکن کے بارہویں صدی کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف قرار دیا گیا ہے، معراج العاشقین کو ۱۳۴۳ھ مین بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے شائع کیا تھا، اور اسکے مقدمہ میں اسکو خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف بتایا تھا۔ لیکن اب شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مولوی صاحب کے خیال کی تردید کی ہے اور بڑی تحقیق و کاوش، خارجی و داخلی شہادتوں اور قرائن سے ثابت کیا ہے کہ یہ خواجہ صاحب کے بجائے مخدوم حسینی کی تصنیف ہے، مصنف کے دلائل میں وزن نظر آتا ہے، مگر آیندہ یہ دیکھنا ہے کہ ان کی یہ تحقیق ارباب نظر کے حلقہ مین کہانتک صحیح قرار دی جاتی ہے، اس کی اشاعت سے اردو زبان و ادب میں ایک مفید ادبی و تحقیقی کتاب کا اضافہ ہوا۔

نقشِ ناتمام - از، جناب مانوس سہسرامی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۸۰، قیمت ۱۲ر پتہ۔ مصنف سے محلہ املی آدم خان سہسرام، (رہتاس، بہار)

جناب مانوس سہسرام ضلع رہتاس بہار کے معمر شاعر ہیں، انکا پہلا مجموعہ کلام "ساز الم" کے نام سے چھپا تھا، اب انہوں نے یہ دوسرا مجموعہ "نقش ناتمام" کے نام سے شائع کیا ہے، اسکا زیادہ حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، آخر مین چند رباعیاں اور دو نظمیں ہیں، مانوس صاحب کی تعلیم زیادہ نہیں ہے، مگر ان میں شعر و سخن کی فطری صلاحیت ہے، انکی زندگی کلفت و عسرت میں بسر ہوئی ہے، اسکی جھلک انکے کلام میں بھی نظر آتی ہے، تاہم یاس و غم کے ماحول میں امید و رجا کی کرن بھی دکھائی دیتی ہے، یہ مجموعہ انکے شاعرانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے، کلام میں بعض ناہمواریوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے وہ اہل ذوق کے لطف کا سامان ہے، شروع میں عبدالغنی صاحب استاد پٹنہ یونیورسٹی نے ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور حاذق ضیائی سہسرامی صاحب نے انکے مختصر حالات تحریر کئے ہیں۔ "ض"